عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

October 1939

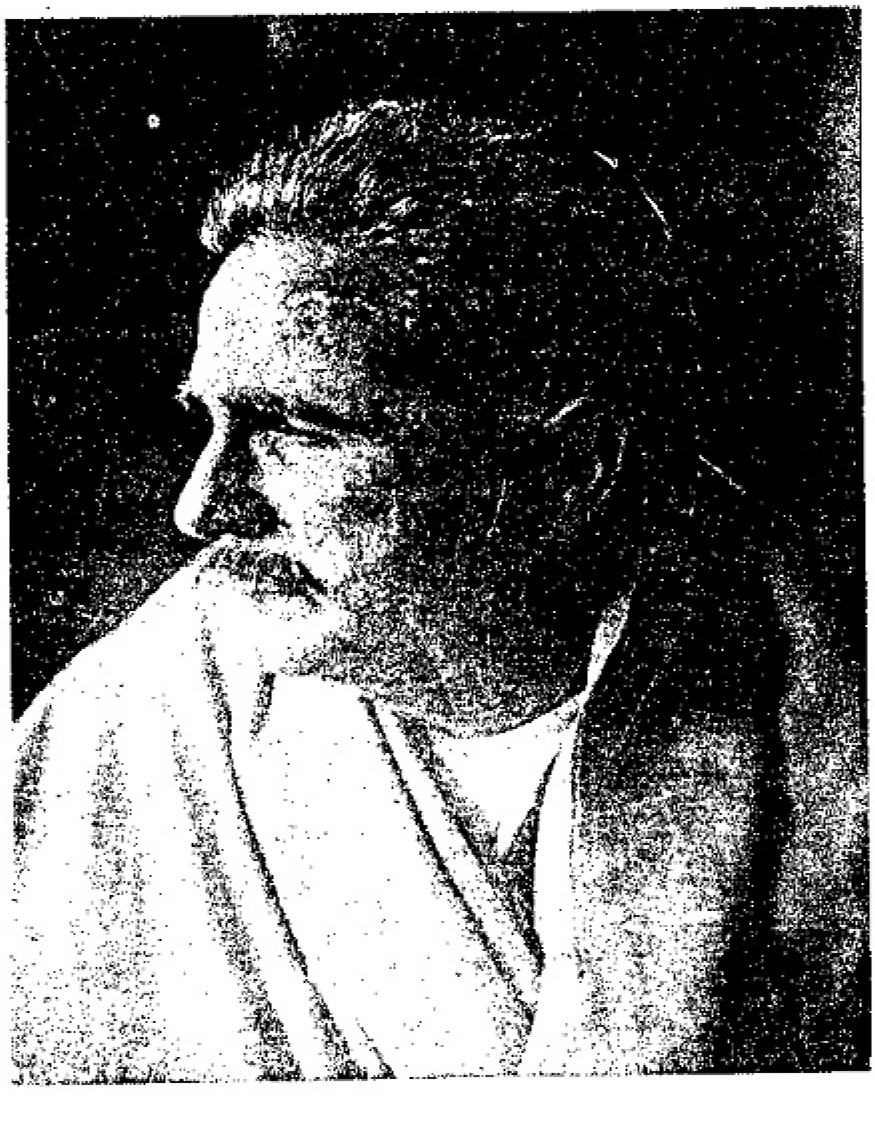

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب	بدلِ اشتراک	پانچ روپیہ سالانہ
محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی	ششماہی	تین روپے
جلد (۲) شمارہ (۶)	شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ	مطابق اکتوبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱	تہذیب؟	علامہ اقبالؒ	۵
۲	لمعات	ادارہ	۶ - ۱۱
۳	جنگ		۱۱ - ۲۰
۴	حقائق	جناب اسد ملتانی	۲۱
۵	حق و صداقت کی آواز	حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی	۲۲ - ۲۴
۶	مسلمان کی زندگی	چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۲۵ - ۴۳
۷	حقائق و عبر	ادارہ	۴۴ - ۵۰
۸	بانیٔ تحریکِ پاکستان	جناب حمید پاک صاحب	۵۱ - ۵۸
۹	مکتبہ جامعہ کی کتابیں	جناب محمد اکرم خاں صاحب مدیر شمس	۵۹ - ۷۸

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریہ قومیت کے جواب میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے چونکہ علامہ اقبالؒ کے انتقال کے چھ ماہ بعد یہ جواب منظر عام پر آیا ہے، جسکے معنی یہ ہیں کہ حضرت مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اسکو مرتب فرمایا ہے اسلیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے اسکا ایک مفصل جواب شائع ہو۔ یہ رسالہ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اسی کا مدلل اور مسکت جواب ہے، جس میں شرح و بسط کیساتھ مولانا مدنی کے دلائل کا جواب کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں متحدہ قومیت کا تصور کیا ہے، اور فرنگی لغت میں اس کی کیا تشریح ہے، اسلام کا نظریہ، فرنگی یا یورپی نظریہ سے کس طرح متصادم ہوتا ہے

مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں،

یہ کتاب آجکل کے جملہ قومی و سیاسی مباحث کے لیے قول فیصل کا حکم رکھتی ہے،

قیمت ۲ر علاوہ محصول

ناظم۔ طلوع اسلام بلیماران دھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکز ملت ← [لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ] → مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یاایہا الذین آمنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار

(فرمان رسول)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

لا اسلام الا بالجماعۃ

(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاران چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب	بدل اشتراک	
محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی		پانچ روپیہ سالانہ
	ششماہی	تین روپے
جلد (۲) شمارہ (۶)	شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ	مطابق اکتوبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱	تہذیب؟	علامہ اقبالؒ	۵
۲	لمعات	ادارہ	۶ - ۱۱
۳	جنگ		۱۱ - ۲۰
۴	حقائق	جناب اسد ملتانی	۲۱
۵	حق و صداقت کی آواز	حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی	۲۲ - ۲۴
۶	مسلمان کی زندگی	چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۲۵ - ۴۳
۷	حقائق و عبر	ادارہ	۴۴ - ۵۰
۸	بانیٔ تحریکِ پاکستان	جناب حمید پاک صاحب	۵۱ - ۵۸
۹	مکتبہ جامعہ کی کتابیں	جناب محمد اکرم خاں صاحب مدیر شمس	۵۹ - ۶۸

تہذیب ؟

انساں کہ رُخ ز غازۂ تہذیب برفروخت
خاکِ سیاہِ خویش چو آئینہ وانمود

پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر
افسونئ قلم شد و تیغ از کمر کشود

ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت
رقصید گردِ او بنواہائے چنگ وعود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید
جز "یسفِکُ الدِّمَا" و "خصیمٌ مبین" نبود

اقبال علیہ الرحمۃ

لمعات

عصرِ حاضر کو "زمانۂ رفتار" Age of Speed کہا جاتا ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ موجودہ زمانہ میں وسائلِ رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت اس درجہ تیز رفتار واقعہ ہوئے ہیں، خود حالات زمانہ اس برق رفتاری سے بدل رہے ہیں کہ پہلے جو انقلابات کہیں صدیوں میں ہوا کرتے تھے۔ اب دنوں میں رونما ہو جاتے ہیں۔ واقعات کی یہ تحیّر انگیز تبدیلی زمانۂ امن میں ہی کچھ کم تیز رو نہ تھی۔ لیکن جنگ چھڑ جانے سے تو نبضِ زمانہ میں خون کی جگہ بجلیاں دوڑ اٹھیں۔ آپ کہہ نہیں سکتے کہ دنیا کو جس حالت میں چھوڑ کر آپ سوئے تھے صبح اُٹھیں گے تو اُس حالت میں کیا کیا تغیّرات پیدا ہو چکے ہونگے۔ ان حالات کے ماتحت ایک ماہوار رسالہ کے لیے تغیرِ واقعات پر ساتھ کے ساتھ تبصرہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ قارئینِ کرام کا وہ دیرینہ اور مستقل تقاضا کہ طلوعِ اسلام کو کم از کم ہفتہ وار ضرور کر دیا جائے۔ ماہِ رواں میں شدّت اختیار کر گیا۔ لیکن ــــــ ہم کچھ لکھنے کو تھے کہ کسی غیب کی آواز نے پکارا کہ ؎

مُسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار!
ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

یہی وجہ ہے کہ ہمیں جزئیات سے بحث کرنے کے بجائے صرف اُصولات تک محدود رہنا پڑتا ہے۔

بالآخر جنگ چھڑ گئی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہی ایک خبر کا گوشہ بھی سامنے آگیا۔ یعنی جناب وائسرائے نے اپنی تقریر میں فیڈریشن کے التوا کا اعلان کر دیا۔ اور یوں وہ بلائے بے درماں جو مرگِ مفاجات کی طرح مسلمانوں کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ کچھ عرصہ کے لیئے پابند نشین ہوگئی۔ قوموں کے لیۓ اس

قسم کی مہلت مغتنمات سے ہوتی ہے۔ لیکن مہلتوں سے فائدہ بھی زندہ قومیں اٹھایا کرتی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمان اس مہلت سے کس حد تک فائدہ اٹھا سکیں گے۔ بہر حال ہم اربابِ مسلم لیگ کی خدمت میں پرزور درخواست کرینگے کہ وہ اس مہلت کو غنیمت سمجھیں اور اپنے آپ کو اِدھر اُدھر کے مسائل میں اُلجھانے کے بجائے۔ تمام توجہات صرف ایک نقطہ پاسکہ پر مرکوز کردیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا آئینی مستقبل کیا ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ لیگ کے سامنے اس باب میں بہت سی اسکیمیں موجود ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم فیڈریشن کو بنیاد فرض کرکے کسی عمارت کا نقشہ مرتب کریں۔ فیڈریشن۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے خاکہ کے مطابق، یا فرعی تبدیلیوں کے ساتھ۔ حالات کی اِن تیز رو تبدیلیوں کے ماتحت جو ہمارے سامنے آرہی ہیں مسلمانوں کی مشکلات کا حل نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کے مصائب کا صحیح حل صرف ایک اسکیم میں ہے اور وہ اسکیم مکمل علیحدگی کی ہے۔ وہ "بدنصیب" مسلمان جنہیں ہندوؤں کے ساتھ کسی معاملہ میں سابقہ پڑتا ہے خوب جانتے ہیں کہ ایسی قوم کے ساتھ ملکر رہنے میں، مادی نقصانات کے علاوہ۔ کس قدر روحانی کوفت اور ہر وقت کی ذہنی کاوش ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم ایک عرصہ تک ایسے حالات کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو تو رفتہ رفتہ اس کی اپنی اخلاقی قوتیں مضمحل۔ اس کی حیاتِ لطیفہ افسردہ اور اسکے جوہرِ انسانیت زنگ آلود ہوجاتے ہیں۔ ہندو اپنے منافع کے حصول اور دوسرے کے جائز حقوق کے غصب کرنے میں جائز و ناجائز ہر طریق کار بلا محابا اختیار کرلیتا ہے (ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس طریق عمل سے خود اسکا قومی کیریکٹر کس قدر پست ہوچکا ہے۔ اسلیے کہ جو قومیں اپنا نصب العین حیات ہی "لکشمی دیوی" (دولت) کی پرستش قرار دے لیں۔ انہیں اخلاقی شعور کا پاس ہی نہیں رہا کرتا)، لیکن اس مسلسل جور و تعدی کے ماحول میں مسلمانوں جیسی مخصوص زاویۂ نگاہ رکھنے والی قوم کے اخلاقی شعور پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ انگریز کی قوت ہندو اکثریت کے ساتھ ہے۔ اسلیے۔ (اللہ دالی ہے میاں سلّو کا) مسلمان جب اپنے آپ کو مظلوم و مقہور دیکھتا ہے اور جابرانہ قوتیں عدل و انصاف کا کوئی راستہ اُسکے سامنے کھلا نہیں رکھتیں تو پھر یا تو اس میں احساسِ عوبیت

(Inferiority Complex) پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اکثر اوقات اسکے سیاسی ارتداد کا موجب بنتا ہے۔ اور یہ اسلام سے مایوس ہو کر اپنے شجرِ ملت سے کٹ جاتا ہے۔ اور دوسروں کے نخلِ تمنّا سے اپنا پیوند لگانے ہیں ہی کامیابی سمجھتا ہے، اِسی کا نام "نیشنلزم" ہے۔ اور یا یہ اپنے آپ کو حوالۂ تقدیر کرکے اپنی رہی سہی عملی قوتوں کو بھی مفلوج کر لیتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اسلام کی تعلیم کے خلاف اور سچے مسلمانوں کی فطرت کے منافی ہیں لیکن اگر آپ موجودہ حالات کو ایک عرصہ تک بدستور رہنے دینگے، تو آپ کی تمام قوم میں یہ مہلک جراثیم سرایت کر جائینگے۔ اور چہ عجب کہ انمیں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں جو اپنے غصب شدہ حقوق کی واپسی کے لیئے مجبوراً فریقِ مخالف سے غیر منصفانہ طریقِ عمل کو جائز سمجھنے لگیں (جو پھر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہوگا)۔ آپ اِس چیز کا اندازہ شاید اِسوقت نہ لگا سکیں کہ مسلمانوں جیسی، قوانینِ الٰہیہ کی وارث قوم کے لیئے ملّی کیریکٹر کے بدلجانے سے صرف اُس قوم کا نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کا کس قدر نقصان ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ان نتائج کا اندازہ آج لگایا جائے کہ وقت گزر جانے کے بعد اِس نقصان کی تلافی ناممکن ہو جائے گی ؎

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس "علیحدگی" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندو اور مسلم دونوں قومیں ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے کی دشمن ہو جائیں گی لیکن ایسا وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنکے سامنے نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ مسلمانوں کی تاریخی روایات۔ اسلیئے کہ جس شخص کے سامنے یہ چیزیں ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ حسنِ سلوک، رواداری اور معدلت گستری کے لیئے اپنے خدا کیطرف سے کس درجہ "مجبور" ہے۔ لہٰذا اِس قوم کی طرف سے "دشمنی" کا خطرہ کیسا؟ اِس شاہیں کو تو یہاں "صحبتِ زاغ" خراب کر گئی۔ ذرا اِسے آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دیجئے، پھر دیکھیے کہ اسکے فطری جوہر کس طرح اُبھرتے ہیں اور وہ تمام نوعِ انسانی کے لیئے کس درجہ امن و سلامتی کے ضامن بنتے ہیں۔ ہندوؤں نے یہاں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے اِسکے پیشِ نظر انکا یہ مزعومہ خطرہ اُنکے نزدیک۔ درست بھی ہے، کہ مسلمان آزاد ہو کر شاید انتقام پر اُتر آئے، لیکن اُنہیں معلوم ہونا

چاہیئے کہ مسلمان اس ذاتِ گرامی صلعم (فداہ ابی وامی) کے وابستہ دامن ہیں کہ جب عمر بھر کے سخت ترین دشمن مفتوح ومغلوب ہوکر پابہ زنجیر سامنے آئے تو حضورؐ نے بلا تامل فرمایا کہ:-

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (جاؤ تم سب آزاد ہو۔کسی پر کوئی مواخذہ نہیں)

جنگ کے سلسلہ میں کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے اپنے فیصلہ کو ایک طویل وعریض بیان کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اگرچہ اِس بیان کے بہت سے گوشے توضیح طلب ہیں لیکن ہم اِسوقت اِس کی ایک "دلیل" کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں، بیان میں جو کچھ لکھا ہے اُسکا ملخص یہ ہے کہ "جنگ کے سلسلہ میں انگریز۔ ہندوستان سے اِسلیئے تعاون واشتراک کا طالب ہے کہ اسکا دعویٰ ہو کہ وہ جمہوریت کی خاطر لڑائی کر رہا ہے۔ لیکن اس کی جمہوریت میں وہی امپیریلزم پوشیدہ ہے۔ جو فاشزم اور نازی ازم کی آمریت میں پنہاں ہے۔ اگر انگریز جمہوریت کی خاطر جنگ کرتا ہے تو اُسے سب سے پہلے ہندوستان کو جمہوریت عطا کرنی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ"

ارباب کانگرس کے نزدیک جمہوریت کے متعلق انگریز کی ستم ظریفی قابل داد ہے لیکن ہمارے نزدیک کانگرس کے دعوے جمہوریت کی ستم ظریفی اس سے بھی زیادہ قابلِ تاسف ہے۔ کوئی اِن سے پُوچھے کہ کانگرس میں جو پوزیشن انھوں نے گاندھی جی کو دے رکھی ہے۔ وہ جمہوریت کی آئینہ دار ہے یا اُس آمریت کی جسکا یہ رونا روتے ہیں۔ اور کیا جمہوری نظام اس کو کہتے ہیں جس کی رُو سے کانگرسی حکومت کے صوبوں میں مسلم اقلیتوں پر گوشۂ عافیت تنگ کیا جا رہا ہے! دوسروں کو امپریلزم کا طعنہ دینے والے ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر دیکھیں تو سہی کہ اُنکے سینہ میں جمہوریت کے جذبات پرورش پا رہے ہیں یا صیحح امپیریلزم کی امنگیں مچل رہی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب ہو یا مشرق۔ جمہوریت کے معنی کہیں بھی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ تا وقتیکہ قرآن کریم سامنے نہ ہو۔ اسکے بغیر تو جمہوریت اور ملوکیت میں صرف قالب کا فرق ہوتا ہے۔ روح دونوں جگہ ایک ہوتی ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

کانگرس کے مذکورہ صدر بیان کے بعد گاندھی جی کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے جس کے دوران میں وہ لکھتے ہیں کہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں "افسوس ہے کہ میں اکیلا اس بات کا حامی تھا کہ برطانیہ کو جو کچھ مدد دی جائے وہ غیر مشروط طور پر دینی چاہیئے۔ یہ خالص عدم تشدد کی بنیادوں پر ہو سکتا تھا۔" یعنی جنگ کے لیئے امداد کی تائید ہو رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ خالص عدم تشدد (اہمسا) کی بنیادوں پر ہے۔ جنگ اور عدم تشدد! کس قدر مضحکہ انگیز امتزاج ہے!! لیکن ہمیں تعجب گاندھی جی کے دماغ پر نہیں جو اس فلسفہ کا مخترع ہے کہ ان کی "مہاتمیت" کا تو راز ہی اس قسم کے معموں میں ہے، تعجب ہے اس قوم کی عقل و بینش پر جو بایں ہمہ انہیں اپنا دیوتا بنائے ہوئے ہے۔ اور اُن سے زیادہ اُن راہ گم کردہ مُسلم قومیت پرست" حضرات پر جو اپنے ہاں قرآن کریم جیسی سراپا نور ہدایت رکھنے کے باوجود گاندھی جی کو اپنا امام بنائے بیٹھے ہیں۔

جنگ کے متعلق مسلم لیگ کے ریزدلیوشن پر تنقید کرتے ہوئے "لالہ آرتھر مُور" (مدیر اسٹیٹس مین) نے ایک مقالۂ افتتاحیہ لکھا ہے۔ یوں تو اس مقالہ کا ایک ایک حرف اس جہالت اور لاعلمی کی غمازی کر رہا ہے جو مغرب کے اِن ہمہ داں استادانِ فن کو اسلام کی تعلیم اور مُسلمانوں کے جذبات کے متعلق ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسکا منقطع کا بند بڑا ہی شاندار ہے۔ جہاں "لالہ صاحب" ایک مجتہد العصر، مفسرِ قرآن، فقیہِ ملت" کی دستارِ فضیلت زیب سر فرما کر اپنی پوری شانِ "شیخ الاسلامی" کے ساتھ فرماتے ہیں کہ "جہاں تک اسلام کو ہم سمجھ سکے ہیں۔ (لیگ کا یہ ریزدلیوشن) اُسکی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔"

اللہ اکبر! ہمارے لیئے اب اسلامی فتاویٰ کن ٹکسالوں میں ڈھلنے لگے ہیں معلوم ہوا کہ جناب لارنس لاوارث نہیں مرے۔ اپنا خرقہ و سجادہ ٹھکانے لگا کر گئے ہیں۔

اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات

اور لیگ کا یہ ریزدلیوشن بھی عجیب ہے کہ

اپنے بھی خفا اس سے ہیں۔ بیگانے بھی ناخوش

جنگ

انسان بھی اک طرفہ تماشا ہے۔

اسے عبادتگاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اسکے اندازِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں اس کی خاک آلود پیشانی پر سطوت و ثروت کے ہزار طرّہ ہائے فلک بوس قربان ہوتے ہیں اسکے ذوقِ جبیں سائی پر جاہ و جلال کی لاکھوں غلط اندازیاں اور شوکت و حشمت کی کروروں طنطنہ خیزیاں تصدق ہوتی ہیں اسکی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اسکے قطراتِ عرقِ انفعال کے مقابل کوثر و سلسبیل کی گہر باریاں ناقابلِ التفات۔ اسکا ایک ایک سجدہ زمین و آسمان کو وجد میں لاتا ہے اور اسکے جذبۂ تعبد و تذلل کی شانِ رعنائی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں

کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پھر اسے کبھی محبّت کے حریم قدس میں دیکھو تو کسی کی یاد میں اسکے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ ظلمت کدۂ عالم میں شمعِ کافوری کا کام دے۔ آفتاب اس کی آتشِ پنہاں سے کچھ حرارت مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کرے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کی تپش و خلش اور سوز و گداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کی آہِ سحرگاہ اور نالۂ شامِ فراق اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ:۔

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!

پھر جب یہ حیرت خانۂ علوم و فنون میں جلوہ ریز ہوتا ہے تو زمین کی پستیوں سے آسمان کی

بلندیوں کے راز ہائے سربستہ فاش کرتا ہے۔ مہر و مہ و ستارہ سب اس کی کمندِ ادراک کے اسیر ہوتے ہیں وہ زہر سے تریاق بناتا ہے جو نوعِ انسانی کے رِستے ہوئے ناسوروں کے لیئے جاں بخش مرہم کا کام دیتا ہے۔ اِسکے فنونِ لطیفہ کی اختراعاتِ جمیلہ اِس خارو یابس محبسِ آب و گِل کو جذبات و احساسات کی حسین جنت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس کی صنعتی گُل کاریاں۔ تہذیب و تمدّن کے قصرِ بلند میں نور و نکہت کے سامان ارزاں کرتی ہیں۔ اور وہ اِن نوادرات کی متاعِ گرانبہا کے پیشِ نظر خالقِ کائنات کے سامنے بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ:۔

توشب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم !

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

لیکن

یہی انسان جب جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے خلاف غم و غصہ میں بھرا ہوا اُٹھتا ہے تو عبودیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز۔ اور علم و حکمت کا نورِ بصیرت۔ سب ایک ایک کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اُسوقت اِس کی خوفناک سبعیت و بربریت وحشی سے وحشی درندوں سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ یہ ایک روح فرسا اژدھا کی طرح پھنکارتا اور ایک ہیبت ناک شیر کی طرح گرجتا اُٹھتا ہے اور تہذیب و تمدّن، عقل و ہوش، علم و بصیرت عدل و انصاف، رحم و کرم، غرضیکہ جوہرِ انسانیت کی ایک ایک خصوصیت کو کچلتا۔ روندتا ایک بھیانک عفریت کی طرح اپنا آہنی پنجۂ استبداد، فریقِ مقابل کے سینہ میں گاڑ دیتا ہے اور اپنے دندانِ حرص و آز کو اس کی شہ رگ میں پیوست کر کے اسکے چشمۂ زندگی سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کرتا ہے۔ اسوقت وہ نوعِ انسانی کی تباہی و بربادی کے لئے کیا کیا

حربے استعمال کرتا ہے۔ اسکا کچھ اندازہ اخبارات کی ان خبروں سے لگایئے، جو مرکزِ دانش و بینش منبعِ علم و ہنر۔ معدنِ حکمت و فلسفہ۔ مصدرِ تہذیب و تمدن۔ یعنی وسطی یورپ کے میدانِ کارزار سے آتشیں گولوں کے ظلمتناک دھوئیں میں لپٹی ہوئی فضائے عالم میں پھیل رہی ہیں آسمان میں آگ، زمین میں آگ، خشکی میں آگ، پانی میں آگ، انفس میں آگ۔ آفاق میں آگ، غرضیکہ ایک جہنم ہے، جو اپنی پوری شعلہ فشانیوں اور آتش باریوں سے نوعِ انسانی پر مسلّط ہو رہا ہے۔ بم۔ گولے، بارود۔ گیس کے اِس طوفانِ حدود فراموش و سیلِ قیود ناآشنا میں محارب و غیر محارب کی کیا تمیز ہو سکتی ہے؟ ماں کو بچے کی خبر نہیں، باپ کو بیٹے کا ہوش نہیں۔ بہن کو بھائی کا پتہ نہیں، میاں کو بیوی کا علم نہیں۔ ایک محشر ہے جس سے اُس قیامتِ کبریٰ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، جس کا تذکرہ اِن الفاظ میں ہوا ہے کہ:۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ۔ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ۔ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى۔ وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝ ۲۲/۱

اُس معینہ گھڑی کا زلزلہ ایک بڑی (ہیبت ناک) چیز ہوگی جس دن تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو بھول جائیں گی۔ اور حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، اور تو لوگوں کو نشہ کی حالت میں دیکھے گا، حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہونگے بلکہ اللہ کا عذاب ہی ایسا سخت ہوگا۔

ایسا ہوش رُبا سانحہ کہ:۔

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ۔ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ۔ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ۔ لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ۔ ۸۰/۳۴

جس دن آدمی اپنے بھائی سے۔ اور اپنی ماں سے، اپنے باپ سے۔ اپنی بیوی اور اولاد

سے بھاگے گا۔ اُس دن ہر شخص کو اپنی ہی ایسی پریشانی، ہوگی کہ وہ کسی اور طرف
متوجہ نہ ہونے دے گی !

جس دن کی آتش فشانی کا یہ عالم ہو گا کہ :۔

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ ۳۲–۳۳

بڑے بڑے محلات جتنے گولے برسائے گا جتنے بڑے جتنے کالے کالے اونٹ ہوتے ہیں

اس آگ اور دھوئیں سے تمام کائنات کا حلیہ بگڑ جائیگا :۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَ
إِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ ۸۱

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا۔ ستارے ٹوٹ کر گر پڑینگے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائینگے
جب گیابھن اونٹنیاں بے مہار چھٹی پھریں گی۔ جب وحشی جانور مارے ہیبت کے اکٹھے
ہو جائینگے۔ جب سمندر بھی بھڑک اٹھیں گے

مصیبت اور پریشانی کا یہ عالم کہ :۔

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۝ ۱۰۱

جب انسان پریشان پروانوں کی طرح اُڑتے پھرینگے۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی اُون کی
طرح (ریزہ ریزہ) ہو جائیں گے !

پوچھیے کسی ایسے شخص سے جنے لڑائی کا میدان دیکھا ہو کہ وہاں کا نقشہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے یا نہیں ؟ عمارتیں کھنڈرات بنجاتی ہیں۔ آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں چلتے پھرتے انسان لاشوں کے ڈھیر بنکے رہ جاتے ہیں۔ جو جیتے ہیں انپر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا ہے۔ زخمیوں کے کراہنے کی آواز۔ سڑتی ہوئی لاشوں کی تعفن۔ بھوک۔ افلاس، خانماں خرابی۔ دشمن کے حملہ کا خطرہ اسیری و غلامی کا دھڑکا۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (بہت سے چہرے ذلیل وخوار اور مصائب کی وجہ سے خستہ وخراب) یہ ہے ماحصل انسان کے علم وحکمت

اور تہذیب و تمدّن کا!

ہمیں تسلیم ہے کہ بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اور دُنیا میں قیام امن و سلامتی کے لیے اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام جیسا صلح و آشتی اور امن پسندی کا مذہب بھی خاص حالات کے ماتحت اُسے لابد سمجھتا ہے لیکن صرف بحیثیت دوا کے نہ بطور غذا کے۔ ہم اسوقت اِس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ وہ کون سے حالات ہیں جنکے ماتحت اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے (یہ ایک جُداگانہ مبحث ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دَورِ حاضرہ کے مہذّب اور متمدن انسان کے طرقِ جنگ اور اسکے نتائج کے مقابلہ میں اُس دَور کے آئینِ جنگ کیا تھے جسے آج کا انسان اپنی کوربصری کی وجہ سے "دَورِ جہالت" قرار دیتا ہے لیکن اگر وہ نگہِ حقیقت شناس سے دیکھے تو خود اعتراف کرلے کہ اُس دَور کی مزعومہ "جُہالت" پر عصرِ حاضر کی ہزار "دانش اطواریاں" قربان کی جا سکتی ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کس قدر احترام سکھایا ہے فرمایا۔

كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ أَنَّهُۥ مَن قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِى ٱلْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ ٱلنَّاسَ جَمِيعًا ۚ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا ٱلنَّاسَ جَمِيعًا ۔ ۵/۳۲

ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جسنے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ علاوہ ان صورتوں میں کہ ملزم نے کسی کی جان لی ہو۔ یا وہ دُنیا میں فتنہ و فساد کا موجب ہو تو یوں سمجھو کہ گویا اُس شخص نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی بچایا تو اسنے گویا تمام نوعِ انسانی کو بچایا۔

اِس آیۂ مقدسہ میں احترامِ نفسِ انسانی کے ساتھ قتلِ انسان کی دو ایسی صورتیں بیان فرمادیں جہاں اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔ انفرادی صورت

توہر روز ہمارے سامنے آتی ہے۔ امن پسند انسانوں کو ایک ظالم وسرکش قاتل کے جوروا ستبداد سے محفوظ رکھنے کی آخری صورت یہی ہے کہ اسکے جُرم کی پاداش میں اُسے بھی حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔ اگر ایک شریر النفس انسان کے ضائع ہو جانے سے سینکڑوں سعید رُوحیں بچ سکتی ہیں۔ تو بامر مجبوری ایسا کرنا ہی قرینِ مصلحت ہوگا۔ وہ اُنگلی جس کا زہر بھرا لاعلاج ناسور تمام جسم کے لیۓ پیامِ موت لیۓ ہوئے ہو۔ یقیناً اِس قابل ہے کہ اُسے کاٹ کر الگ کر دیا جائے تاکہ باقی جسم خواہ مخواہ ضائع نہ ہو جائے۔ یہ انفرادی شکل ہے لیکن اگر فتنہ و فساد کا جذبہ ایک فرد کے بجائے ایک قوم میں موجزن ہو تو نوعِ انسانی کی حفاظت کے لیۓ اس کی آخری تدبیر بھی یہی ہے کہ اس قوم کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ خود بھی شرافت کی زندگی بسر کرے۔ اور دوسروں پہ بھی گوشۂ حیات تنگ نہ کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر فرمایا کہ ان حالات کے ماتحت۔

فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى إِذَآ أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا۔ ۴۷/۴

ترجمہ

اُن سے لڑائی کرو، یہاں تک کہ جب اُن کی کمر ہمّت ٹوٹ جائے تو اُن کو مضبوط باندھ لو، پھر یا تو بطور احسان چھوڑ دو۔ یا معاوضہ لے کر۔ یہاں تک کہ خود لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

اِسلیۓ کہ اَلْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ خرمنِ انسانی میں فتنہ کی چنگاری کا موجود رہنا اسکا سر کچل دینے سے کہیں زیادہ مہیب و خطرناک ہے۔ لیکن مقصد صرف فتنہ کی سرکوبی ہے فساد کا استیصال ہے۔ اپنی جارحانہ قوتوں کا مظاہرہ نہیں۔ اِسلیۓ جسوقت یہ دیکھو کہ فساد برپا کرنے والی قوتوں کی کمرِ ہمّت ٹوٹ گئی ہے۔ اُن کی گردنِ فرعونیت حق کے سامنے جھک گئی ہے۔ اسی وقت رُک جاؤ اگر اُسکے بعد کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو یاد رکھو اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سُورۂ بقر کے چوبیسویں رکوع میں اِس حدود بندی کی

تشریح اِن الفاظ میں ملتی ہے۔

اوُر اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں۔ لیکن زیادتی مت کرو۔ اِس لیئے کہ اللہ تعالےٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (جب اس شکل میں لڑائی ہو جائے تو) پھر انہیں جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے اُنہوں نے تمہیں نکال باہر کیا تھا تم بھی اُن کو نکال دو۔ کہ فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ لیکن مسجدِ حرام کے قرب جنگ مت کرو۔ جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ ہاں اگر خود ہی لڑنے لگیں تو تم بھی ان کو مارو (ایسے) کفار کی یہی سزا ہے۔ لیکن اگر وہ باز آجائیں تو اللہ غفور الرحیم ہے۔ اور ان سے لڑائی کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لیئے ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو پھر سوائے ظالموں کے اور کسی پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی ...... جو تم پر زیادتی کرے۔ تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور یقین جانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

سوُرۂ نساء میں ہے۔

"بعض لوگ تمہیں ایسے بھی ضرور ملیں گے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ (لیکن) جب کبھی انہیں فتنہ و فساد کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں۔ پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں۔ تو تم انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ انہیں مارو اور ہم نے تمہیں اُن پر صاف حجت دی ہے"۔

یعنی فتنہ و فساد روکنے کی جب کوئی اور صورت باقی نہ رہے تو اس وقت جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اطمینان ہو جائے کہ فساد کا استیصال ہو گیا ہے تو پھر جنگ جاری رکھنے کی کبھی اجازت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر صلح و امن پسندی۔ عہد و میثاق کے بعد سرکش تو تیں پھر آمادۂ جنگ ہوں۔ تو اُن کی فرعونیت کو پھر روکو۔ حتےٰ کہ وہ اس قسم کی تدابیر سے باز آجائیں فرمایا۔

"اگر یہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کرنے لگیں۔ تو تم اس غرض سے کہ یہ لوگ ان حرکات سے باز آجائیں۔ اِن پیشوایان کفر سے لڑو۔ اِس لیئے کہ اس صورت میں اُنکا عہد و میثاق باقی نہیں رہا" 9/12-12

اِس لیئے کہ اگر اُن کی فساد انگیز قوتوں کی مدافعت نہ کی جائے تو تمام کائنات فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنجائے۔ فساد کے مقابل میں عدل و اصلاح اور باطل کے مقابلہ میں حق کا غالب رہنا نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیئے ازبس ضروری ہے۔ کہ:۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ 23/71

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے۔ تو زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے سب میں فساد برپا ہو جائے

سب سے بڑی چیز یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کمزور جماعتوں کی حفاظت قوی جماعتوں کے ہاتھوں نہ کرائے تو دُنیا سے مذہبی آزادی سلب ہو جائے۔ جس جماعت کو غلبہ حاصل ہو جائے وہ مغلوب جماعتوں کے مذہبی شعائر کو منہدم کر کے رکھ دیں۔

"اگر اللہ انسانوں کی بعض جماعتوں کو دوسری جماعتوں کے ذریعے روکتا نہ رہے تو گرجے اور صومعے اور مندر اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر بکثرت ہوتا ہے سب گرا دیئے جائیں" 22/40

اس اُصول کو بیان کر کے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو دُنیا میں قوت و غلبہ حاصل ہوگا تو اُن کا مسلک جور و تعدی نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ دُنیا میں رہیں گے تو اِسلیئے کہ خدا کی عبودیت کے اُصول کو قائم کریں۔ دولت مندوں کے مال سے غریب اور کمزور انسانوں کی مدد کریں۔ جہاں جہاں بُرائی ہو اُسے روکیں اور اسکی جگہ بھلائی کا حکم دیں۔ گویا مسلمان اللہ کا ایک سپاہی ہے۔ جہاں کہیں کسی مظلوم پر زیادتی ہو اُس کی تلوار اس کی حفاظت کے لیئے بے نیام ہو جانی چاہیئے۔ فرمایا:۔

"یہ تو وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں غلبہ حاصل ہوگا تو یہ خدا کی عبادت کو قائم کرینگے

زکوٰۃ دینگے۔ بھلائی کا حکم دینگے۔ اور برائی سے روکیں گے۔ اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ [۲۲/۴۱]

اسلام کے نزدیک جنگ صرف قوانین الہٰیہ کی حفاظت اور تنفیذ کے لیے جائز ہے اسکے علاوہ کسی اور جذبہ کے ماتحت جنگ کی جائے تو حرام ہے۔ اگر حسد و رقابت۔ بغض و عداوت، باہمی منافست۔ جوع الارض کے جذبات جنگ کے محرک ہیں تو وہ جنگ اسلام کے نزدیک کبھی جائز نہیں ہوسکتی۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا:۔

لا تباغضوا۔ ولا تحاسدوا۔ ولا تدابروا

ایک دوسرے سے دل میں بغض و عداوت نہ رکھو۔ باہم حسد نہ کرو۔ اور ایک شخص کو ہٹاکر اس کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔

پھر اسلامی جنگ میں کسی قسم کی وحشت و بربریت جائز نہیں۔ بوڑھوں۔ بچوں۔ اور عورتوں کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ کسی کہن سال کو۔ بچے کو۔ کمسن کو۔ عورت کو قتل نہ کرو۔ دشمن کو پکڑکر اور باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں۔ (ایضاً)۔ دشمن کی جو سپاہ میدان جنگ میں آکر مقابلہ کرے صرف اسکے خلاف ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ انکے گھروں میں گھس کر غیر محارب (Civil) آبادی کو تنگ کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ ابوداؤد میں حضرت انس جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں کسی غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا۔ لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جاکر انہیں تنگ کیا۔ لوٹا مارا۔ آپنے ایک شخص کو بھیجا اسنے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اسکا جہاد قبول نہیں"۔ پھر لوٹ کھسوٹ کا مال بھی اسلامی جنگ میں ناجائز ہے، (مالِ غنیمت الگ شئے ہے)۔ سُنن ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی اکرمؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے بھوک کی سخت تکلیف ہوئی۔ اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں۔ انہیں لوٹ لائے اور ذبح کرکے ہانڈیاں چڑھادیں۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے" اور جو کمان ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں

اُلٹ دیں۔ اور فرمایا کہ "لوٹ کی چیز مُردہ سے بڑھ کر حلال نہیں"۔ پھر دُشمن کے قاصدوں کو کبھی قتل نہیں کیا جاسکتا سیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اُسنے گُستاخانہ گفتگو کی تو آپ نے فرمایا کہ "قاصد کا قتل کرنا جائز نہیں، ورنہ تو قتل کر دیا جاتا"۔ اسیرانِ جنگ سے اپنے عزیز مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا جب حضورؐ نے اسیرانِ بدر کو صحابہ کے حوالہ کیا تو تاکید فرمادی کہ اُنہیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گذارہ کرتے تھے۔ اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ دشمن کو آگ کا عذاب نہیں دیا جاتا تھا کیونکہ حضورؐ نے فرمایا کہ آگ کا عذاب صِرف خدا ہی دے سکتا ہے۔ مقتولین کے اعضاء کاٹنے (مثلہ) کی وحشت انگیز رسم کی بھی شدّت سے ممانعت فرمادی سب سے بڑی چیز یہ کہ عہد کی سخت پابندی کی جاتی تھی۔ قرآن کریم میں اِسکے متعلق جابجا تاکیدی احکام موجود ہیں۔ عہدِ نبوت اور خلفائےؓ راشدین کے زمانہ میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ اِن تمام متفرق احکاماتِ جنگ کی بنیاد اس محکم اُصول پر ہے کہ لڑائی صرف "خدا کا نام بلند کرنے" کے لیئے ہوگی۔ کسی ذاتی جذبہ کے ماتحت نہیں ہو گی۔ ایک شخص نے حضورؐ صلعم سے دریافت کیا کہ "کوئی شخص غنیمت کے لیئے، کوئی نام کے لیئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لیئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائیگا۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ العلیا۔ جو شخص اِس لیئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اور خدا کا بول بالا اسی طرح ہوتا ہے کہ دُنیا میں اس کی بادشاہت قائم ہو۔

ان اُمور کو پیشِ نظر رکھیئے اور پھر دَورِ حاضرہ کے "متمدن" انسانوں کے طُرقِ جنگ و آئینِ حرب پر نگاہ ڈالیئے اور خود اندازہ فرمایئے کہ وہ تمام "علمی ترقیاں" جنہیں آج کا انسان اس قدر گرانبہا متاع شمار کرتا ہے، بربادی اور تباہی کے آلات و ذرائع کے سوا اور کس کام آرہی ہیں، لیکن اگر یہی علمی ترقیاں۔ آئینِ خداوندی کے ماتحت ظہور میں آئیں تو دُنیا کی جہنم۔ سکون و طمانیت کی جنت میں تبدیل ہو جائے۔ وَفِیْھَا اٰیَاتٌ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

حقائق

(اسد ملتانی)

یکے را جنگ ازاں مقصود گردد
که جنگ اندر جہاں نابود گردد
دگر کس جنگ ازیں اندیشہ جوید
مبادا تیغ زنگ آلود گردد

نظام آنست شایانِ قیامے
که باشد مُوجبِ امن و سلامے
وگرنہ آں ہم آیئنے بدارد
اگر گیری ز قزّاقاں نظامے

چو رہزن را بدست آید خزانہ
سخاوت می کند شاہنشہانہ
نگوید کس که مال او حرام است
اگر تقسیم باشد مُنصفانہ

حق وصداقت کی راہ

اخبارات میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ، ناظم دارالعلوم دیوبند و صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، ضلع سورت، کا ایک مکتوبِ گرامی شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ موجودہ سیاسی کش مکش میں مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل کونسی ہے۔ ہم اس مکتوب کو جریدہ عصرِ جدید (کلکتہ) کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ تاکہ وہ حضرات جو کہا کرتے ہیں کہ "کوئی مقتدر عالمِ دین شرکت کانگریس کے مسلک کی مخالفت نہیں کرتا" عوام کو دھوکے میں مبتلا نہ کر سکیں۔ طلوعِ اسلام

مولانا عثمانی صاحب کا مکتوبِ گرامی

بعد سلام مسنون آں کہ آپ نے شرکت کانگریس کے متعلق میرے خیالات دریافت کئے ہیں، اس مسئلے کے متعلق میں اپنے خیالات کا اعلان پہلے بھی کر چکا ہوں اب پھر لکھتا ہوں کہ میں نہ کبھی کانگریس میں شامل ہوا اور نہ اب شامل ہوں بلکہ اس شمول پر میں نے کانگریسی علمائے کئی دن تک بہت شدّومد سے بحث کی جس کا تذکرہ اخبارات میں آچکا ہے۔

قومیت متحدہ کا نظریہ جو کانگریس کے دستور اساسی کا بنیادی پتھر ہے اس معنی میں جو کانگریس کے ائمہ اس سے ارادہ کرتے ہیں میرے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے کبھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔

میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں نہ سیاسیات میں کوئی خاص اشتغال رکھتا ہوں تاہم اپنی قوم کے سود و بہبود کو سوچنا اس کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے میرے لیے بھی ناگزیر ہے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے لیے سب سے پہلے ایک خالص اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے اس کے بدون کسی نام نہاد قومیت متحدہ کے تیز رَو

دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خودکشی کے مرادف ہے۔

مسلمان دوسری قوموں سے صلح کرسکتے ہیں، عہد و پیمان کرسکتے ہیں، بہت سے اُمور میں تعاون اور اشتراکِ عمل کرسکتے ہیں، لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کرسکتے۔ میں اپنے لیے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کرسکتا۔ شاعر حکیم اکبر مرحوم (الٰہ آبادی) نے خوب کہا ہے ؎

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی
لطفِ دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی

بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو
دَیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

پختہ ہو کر اپنی شاخِ وطن سے ہوتا ہے جُدا
اے ثمرِ چشمِ محبت میں تری خامی بھلی

اسی کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری ناکامی و نامرادی کا اصلی سبب شریعت کاملہ محمدیہ کے اصول و احکام سے اعراض و انحراف ہے اور اسی کے نتیجے میں اس تخریب و تفرق کا عذاب ہم پر مسلط ہے جس کی طرف قل هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اسی لیے میرا سب سے بڑا مطمح نظریہ ہے کہ جہاں تک استطاعت میں ہو مسلمانوں کو اتباعِ شریعت اور تمسک اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ نیز ان کی پارٹی بندیوں کو اگر بالکلیہ ختم نہ کیا جاسکے تو ان کو کم کرنے اور ایک کو دوسرے سے قریب لانے اور خلاف و شقاق کے مضار کو محدود کر دینے کی سعی جاری ہے۔

رہا دارالعلوم دیوبند کا معاملہ جیسا کہ پہلے بھی بار بار اعلان کیا جاچکا ہے وہ مسلمانانِ ہند کی ایک محبوب و مشترک متاع ہو۔ سیاسی پارٹی بندیوں سے اس کو کوئی تعلق نہیں یہی وہ مسلک ہے جو میرے زمانے میں مجلس عاملہ دارالعلوم نے بالاتفاق طے کیا ہے اور دارالعلوم کے تمام ملازمین و مدرسین کو سختی کے ساتھ اس کا پابند کیا

جو خبریں اس کے خلاف شائع کی جارہی ہیں بعض بالکل بے اصل اور بعض سخت مبالغہ آمیز ہیں۔

راقم شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از ڈابھیل، ضلع سورت، ۳ رجب ۱۳۵۸ھ

(ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ مجلس عاملہ دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ صدر فیصلے کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے کانگریس کی عملی حمایت کی "اجازت خصوصی" کیسے حاصل کر رکھی ہے۔ اور جب وہ اس فیصلے کے باوجود اپنی روش پر قائم ہیں تو مجلس عاملہ ان کے خلاف کوئی چارہ جوئی کیوں نہیں کرتی۔ ارباب دارالعلوم اس باب میں اگر کچھ تصریح فرمانا چاہیں تو طلوع اسلام کے صفحات اس کے لیے کھلے ہیں۔ طلوع اسلام)

ادارۂ طلوع اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ طلب فرمایئے اور ملاحظہ کیجیے کہ

ان میں سیاست حاضرہ کے اہم مسائل کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں

کس

حسن و خوبی سے پیش کیا گیا ہے

ادارہ

کی جملہ مطبوعات کا منافع طلوع اسلام کے شعبۂ تبلیغ کی طرف منتقل

کر دیا جاتا ہے

مسلمان کی زندگی

(بہ سلسلۂ "خدا کی بادشاہت" وغیرہ)

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز، بی۔ اے

انسان پر جب مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں، ظلمت کدۂ عالم میں اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی تمام اسباب وعلل ایک ایک کر کے جواب دے دیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذرّوں سے اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ وہ انکی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی اُسے مسلسل مصائب وتکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے۔ انسان اسے ایک بے کس وبے بس مجبور ومظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور وستم اور ظلم واستبداد کی الم ناک صعوبتیں جھیلنے کے لیے اس وحشت ناک کرہ میں بھیجا ہو چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اُسے دیکھے۔ اس لیے جب وہ اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرت وشادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر چہرہ تبسم ناآشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے وہ سوچتا ہے اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ:-

"زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے خالص اور دوامی مصائب۔ ہر آرزو ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ لہذا سکون واطمینان عدم آرزو میں ہی ہے۔" (مہاتما بدھ)

وہ حیات انسانی کو ایک لغو وباطل شے قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ "زندگی محض سراب ہے، دھوکا ہے۔ مایا کا جال ہے۔" (اپنشد) وہ "زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق خیال کرتا ہے" (شوپنہار) وہ اس مصیبت کدے سے دور بھاگنا چاہتا ہے اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ چوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں۔ اس لیے اسے عام انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور عام انسانوں میں سے چونکہ صاحبان ثروت واقتدار کو وہ اپنی لُٹی

ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے۔ اس لیے دولت و ثروت۔ شوکت و سطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے وہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دور جنگلوں میں جا کر بسیرا کر لیتا ہے اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و عزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے وہ یہ کہہ کر اپنے قلبِ محزوں کو تسلّی دے لیتا ہے کہ خیر اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہے کر لیں وہ آسمانی بادشاہت میں تو ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ ستم رسیدہ، کمزور، ناتوان ضعیف، مغلوب و مقہور انسانوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لیے نہیں ہے۔ اس کے طالب خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے ایک اور جنم ملنے والا ہے۔ جس میں دولت و حشمت کے مالک ذلیل و خوار ہوں گے۔ اور جو آج ذلیل و خوار ہیں و معزز و مکرم۔ آسمانی بادشاہت انہیں مفلس و غریب انسانوں کی وراثت ہو۔ نروانا میں یم کے مقرب یہی لوگ ہوں گے۔ دیولوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے یہی بھگت ہیں۔ یہی تعلیم کنیسہ صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے۔ یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیاسی اور تیاگی بھکشو کا سچّا دھرم ہے۔ اس فلسفہ اور مشرب کی لِم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کر کے مستقبل کو مزیّن بنایا جائے۔ دنیا کی رسوائیاں عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں۔ یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزّت ہو۔ یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو۔ یہاں کا محتاج وہاں کا غنی۔ یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوش حال۔ اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو، وہ یہاں کے مصائب آلام کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھائے کہ یہ اُسے وہاں کی ابدی مسرتوں کا پیام دے رہے ہوں غرضے کہ وہ دنیا و آخرت کے درمیان ایک ایسے ناقابل شکست آئینہ کی سدِ سکندری قائم کر دے کہ جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم فطرت کی تعلیم قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور و مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانے میں عمر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقعہ یہی منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کر دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابل نفرت و ملامت ہیں۔ کیا یہاں کی ہر سہانی

شئے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے۔ کیا مقصد حیاتِ انسانی۔ ذلت و رسوائی۔ محتاجی و ناداری۔ نکبت و مسکنت۔ افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے۔ پھر کیا ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم۔ یہاں کی رسوائیاں اور ذلتوں کے معاوضے میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہوگی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی دبکتی دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہوگا۔ جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرے۔ کیا دولت و حشمت۔ عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہوگی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا باب السلام قطعاً مسدود ہوگا۔ کیا یہاں کے چاندی اور سونے کا ہر ٹکڑہ جہنم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا۔ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے۔ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب۔ آپ اپنے دماغ سے، کہ جس پر ایک عرصہ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے قفل پڑے ہوئے ہیں، کچھ ہی دیکھئے اور اس سے مطمئن ہو جائیے لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم ان کی بابت میں کیا تعلیم دیتا ہے کہ وہی تعلیم تعلیمِ فطرت اور وہی حکم حکمِ خداوندی ہوگا۔

قرآن کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کی خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (۴۵/۱۳)	پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموٰت) میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔

لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے فطرت کی ہر چیز سے کام لے کہ ایک مدتِ معینہ تک یہ سب اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدائے تعالیٰ نے قطعاً حرام نہیں کیں (۷: ۳۲) بلکہ ان میں انسان کے لیے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے (۳: ۱۳) ان سے تمتع حاصل کرنا۔ ان سے فائدہ اٹھانا۔ ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کی فراوانی اور اس کے غلط استعمال سے انسان میں بعض عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا غلام بن جانے سے بہت سے انسانی جوہر زائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت

و پستی کی زندگی بھی تو انسانی تخلیق کی غرض و غایت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انبیاء کرام کی تعلیم ہمیشہ اس افراط و تفریط کو مٹانے کے لیے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا۔ اس باب میں اس کا شروع سے آخیر تک ایک ہی سلوک اور ایک ہی لَم رہی ہے۔ یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت و سطوت کی زیادتی اور اس کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو اُبھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو ایسی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیب پیدا نہ ہوں جو "مترفین" میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ دولت و ثروت کے غلط استعمال سے خشیت الٰہی۔ جسے قرآنی اصطلاح میں تقوےٰ کہا جاتا ہے۔ لوگوں کے دلوں سے اُٹھ جاتی ہے جس سے تمام نظام انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضرات انبیاء کرام جن مستضعفین کو اُبھار کر بلند سطح پر لاتے تھے۔ انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا! تم اُن حدود اللہ کی نگہداشت کرنا۔ ورنہ ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے۔ وہ قوانین الٰہی سے منہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا ضابطہ انہیں بتا دیتے تھے۔ جس سے ان کے اور خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس کی خشیت اور تقویٰ کو وہ کسی وقت نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اور اس کے بعد زمین اور آسمان کی بادشاہت کے وارث بنتے چلے جائیں بس یہ خلاصہ تعلیم فطرت کا جو انسانوں کی ہدایت کے لیے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کا نام دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سُرخروئی ہے۔ میزان خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظام انسانیت کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں۔ جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اُڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے ابھر نہیں سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں۔ جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ یاد رہے کہ اگر خشیت و تقویٰ کہ جسے آپ روحانیت کہہ لیجیئے۔ خدا کی رحمت و بخشش ہے تو دنیاوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوام عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ حضرت

ھُودؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور تمہیں قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہذا۔

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۶۹:۷) اللہ کی یہ نعمت یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قوم ثمود سے کہا:۔

"تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اس نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین بنایا۔ اور تمہیں زمین میں متمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو۔ اور پہاڑوں کو تراش تراش کران میں (محفوظ) عمارات تعمیر کرتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو پیش نظر رکھو۔ اور زمین میں فساد مت پیدا کرو" (۷۴:۷)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے اور اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی۔ (۸۶:۷)۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۲۰|۱۶۱)۔ اور آلِ ابراہیمؑ۔ کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ "ملکِ عظیم" کی بھی مالک بنائی گئی۔ ۵۴:۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر ابتلا و آزمائش کے بعد جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا وہ یہی تمکن فی الارض تھا۔ اور اس عطیہ کبریٰ کو ان کے صبر و تقوےٰ کا اجرِ جزیل کہا گیا۔

"اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں صاحب حکومت بنا دیا۔ (تمکن فی الارض کردیا) جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچا دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے" (۵۶/۱۲)

حضرت موسےٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت و حشمت، تمکن و تسلّط کی مسلسل تاریخ ہے اور اس کی اہمیّت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس تکرار و اصرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ کوئی اور واقعہ اس شدّ و مد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر احسان کہا گیا ہے۔

"ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کر دیا گیا تھا۔ ان پر احسان کریں۔ اور ان کو دوسروں

کا امام بنا دیں۔ اور ان کو (ملک کا) وارث قرار دے دیں۔ اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کر دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔" (۲۸: ۵-۶)

چنانچہ اسی ضعیف و ناتوان، اسی محکوم و مغلوب قوم کو بالآخر مشارق و مغارب کا حکمران بنا دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۷: ۱۳۷)

اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی۔ اس بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا اور آپ کے رب کا وعدہ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا۔ اور ہم نے فرعون اور اسکی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

صبر و توکل، سعی و عمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لیے حضرت موسیٰ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔

"موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدائے تعالیٰ سے مدد مانگو۔ اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بنا دے۔ اور آخری انجام تو متقین کے لیے ہی ہے۔" (۷: ۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی ہے۔

"اے بنی اسرائیل۔ یاد کرو۔ میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا۔ اور تمہیں تمام اقوامِ عالم پر برتری عطا کی تھی۔" (بقرۃ و دیگر مقامات)

اور جب اسی قوم نے قوانین الٰہی سے سرتابی اختیار کر لی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اسی نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱)

اور ان پر ذلت اور مسکینی کی مار ماری گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

مذکورۂ صدر قصص ۔ قرآن کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم امم گزشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہے اور بار بار تاکید کرتا ہے ۔ کہ غور و فکر سے دیکھو کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْن جن قوموں نے قوانین الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا ۔ ظاہر ہے کہ ان اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف توجہ دلانا ہی مقصود ہے ۔ کیونکہ اُخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے آ نہیں سکتا ۔ ان میں سے بہت سی قومیں تو قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرف مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی محض داستانیں باقی رہ گئیں وجعلناھم احادیث (۲۳ : ۴۴) اور بعض قومیں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں) لیکن ان کی حالت عبرت و نصیحت کی زندہ داستان ہے پھر قرآن کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ۔ بلکہ واضح الفاظ میں یہ ذہن نشین کرادیا کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت و نعمت ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اس کا غضب اور عذاب ہے ۔ مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ "تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا بادشاہ بنائے گا" (۲۴ : ۵۵) کہیں یہ تشریح ہے کہ "جو کوئی عمل صالح کرے گا ۔ وہ مرد ہو یا عورت شرط یہ ہے کہ مومن ہو ۔ تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے ۔ اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے" (۱۶ : ۹۷) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے ۔ (۱۶ : ۴۱) جو اس کے دیے ہوئے کی قدر کرتا ہے' اپنی قوتوں اور اسکی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے ۔ کہ یہی عملاً شکر نعمت ہے ۔ اللہ ان نعمتوں میں اور زیادتی کرتا جاتا ہے ۔ (۱۴ : ۷) ۔ برعکس اس کے "جو اس سے بلا علم و ہدایت ۔ بلا دلیل و برہان جھگڑتا ہے ۔ اس کے قوانین سے منہ موڑ لیتا ہے ۔ خود بھی منزلِ مقصود تک لے جانے والے راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بھٹکاتا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور اس کے بعد کی زندگی میں عذاب حریق ملے گا" (۲۲ : ۸) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے ملنے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اُسے اختیار کرے ۔ اور جس میں کسی قربانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ طبع سہولت پسند

پر گراں گزرے۔ اس سے پہلو تہی کرے۔ اس کے لیے بھی خزی فی الحیٰوۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے۔ (۲:۸۵) ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں۔ اس اعتقاد کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد اب مسلمانوں کے لیے ایک دستور العمل ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا کہ جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے۔ جو اقوام گزشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود تھا۔ ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (۷:۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔

اور اسی ایمان و تقوے سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

"اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائیگا اور تمہاری لغزشوں کو دور کر دے گا۔ اور تم کو معاف کر دے گا اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ (۸:۲۹)

اس لائحہ عمل کی رو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد۔ غیر منقطع سعی و عمل۔ ان تھک کوشش۔ کوہ شکن عزم۔ غیر متزلزل استقامت۔ پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسنِ عمل۔ اپنے اعمالِ صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی۔ محتاجی و فلاکت کی زندگی۔ مجبوری و بے بسی کی زندگی۔ کہ جسے قرآن نے غضب کی زندگی قرار دیا تھا۔ نصیبِ اعدا کر کے خود عزت و وقار کی زندگی۔ خوش حالی و خوش بختی کی زندگی عظمت و شوکت کی زندگی۔ حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا کہ یہی قرآنِ کریم کی رو سے ایک مومن و عمل صالحہ کرنے والی جماعت کی حیات طیب ہو سکتی تھی۔ ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل اپنے اللہ کو راضی کر کے خود اس سے راضی ہو جانا تھا۔ اور اس سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا۔ (۳:۱۴۷) وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم سے وراثتِ کتاب کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ (۳۵:۳۲) جسے نوعِ انسانی میں سے بہترین امت قرار دیا تھا (۳:۱۰۹) ایسے عباد صالح بننا تھا جن کے لیے وراثتِ ارضی مقدر ہو چکی تھی۔ (۲۱:۱۰۵) اور عملاً بتا دینا

تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کے لیے ایک عظیم الشان پیغام موعظت ہے۔ بلاغ مبین ہے (۱۰۶ : ۲۱) اور ساری دنیا کو دکھا دینا تھا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰:۶۴)	ان کے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں، اور آخرت میں بھی یہ قانون الٰہی غیر متبدل ہے۔ اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں، بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا۔ کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں۔ (۴۰:۵۱) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ سکان ارضی کو عملاً بتا دینا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے۔ (۲:۴۵) کس طرح دشمنوں کے جم غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر رکاب چومتی ہے۔ (۸:۴۵) الغرض انہیں اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر کے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں۔ ہر قسم کی کامیاں صرف مومنین کے لیے ہیں۔ مجاہدین کے لیے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹:۸۸) اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ انہوں نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا اور ان کے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دئے جو ان سے کئے گئے تھے۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرًا (۳۳:۲۷)	اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور اس سرزمین کا بھی کہ جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے۔ اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے۔ لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لیے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے۔ (۸:۴۳) جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں کہ جس سے یہ انہیں زیادہ دکھائی دیں۔ (۸:۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی کہ جن کو کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعدا کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا۔ (۸:۱۲) کبھی ان میں

کا ایک ایک دو دو پر بھاری ہوتا۔ (۸:۶۶)۔ کبھی دس دس پر۔ (۸:۶۵) ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ اس کی پلٹی ہوتی۔ (۸:۱۷-۸) ان کے مقابلے میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی اور نہ قوت۔ اس لیے کہ یہ قوانین خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے۔ اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ میں اور ہر میدان ان کے قبضے میں ہوتا۔ اور اس طرح سے بتا دیا جاتا کہ فانصرنا علی القوم الکافرین کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کا وعدہ ہے چنانچہ اس وعدے کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تیز و تند مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا۔ چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجر طیب کی طرح بڑھا۔ پھولا، پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

"محمد۔ اللہ کے رسول۔ اور ان کے ساتھی۔ کفار کے مقابلہ میں سخت آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کر رہے ہیں۔ کبھی سجدوں میں پڑے ہیں۔ اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں۔ اور انجیل میں ہیں۔ جیسے کھیتی کہ جس نے پہلے اپنی سوئی نکالی۔ پھر اس نے اس کو قوی کیا۔ پھر وہ اور موٹی ہوئی۔ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ کہ دانے دیکھ دیکھ کر کسان کا دل مسرت سے اچھل پڑے۔ اور اس سے حاسدین کو جلائے اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا۔ (وہ یوں پورا ہو کر رہا)" (۴۸:۲۹)

چنانچہ اللہ کے یہ صحیح مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے اور وہ وقت انہیں یاد آتے "جب وہ قلیل تھے۔ زمین میں کمزور و ناتواں شمار کیے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں۔ سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی اور ان کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں۔ کہ وہ خدا کے شکر گذار بندے بنیں" (۸:۲۶) تو مسرت کے سجدے

تھے جن کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کرکے اعلان کرتے کہ :

یہ وادیٔ ضجنان وہی ہے جس میں میں ایک اونی کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ سخت مزاج آدمی تھے۔ کام لیتے تھے تو تھکا دیتے تھے۔ کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت حائل نہیں۔"

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین۔ عبادات کا صحیح مفہوم۔ اعمال صالح کی سچی تفسیر دنیا اور آخرت کا اصلی تعلق۔ قرآن کریم کی عملی شکل۔ اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر۔ ہر مسلمان کے سامنے تھی۔ بہت جلد ختم ہوگیا۔ خلافت ملوکیت سے بدل گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں نمودار ہوگئیں۔ اور اس کی انتہا عہد عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی تھا اور روح یکسر عجمی ہو چکی تھی۔ سامان تعیش کی فراوانی سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں۔ وہ مجاہدانہ زندگی جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی۔ اب بیگار کے بھرتی شدہ۔ مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ گرمجوشی کی وہ فاروقی رُوح جو خالد ابن ولید کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اُٹھتی تھی۔ (حالانکہ وہ میدان جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے اُنہوں نے ایسا کیا تھا) اب عہد کہن کا افسانہ بن چکی تھی۔ تقسیم عمل سے عملی برہمنیت پیدا ہو چکی تھی۔ علماء کا طبقہ بجائے تیر و سنان کے اب لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا۔ ارباب طریقت وحدت وجود کے تباہ کن نظریہ کے ماتحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر بیٹھے تھے۔ یہ سب سامانِ ہلاکت جمع ہو چکے تھے کہ شامت اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی۔ اسلام کی مرکزی قوت فنا ہوگئی۔ اجتماعیت کی شان بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات اب مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے (الّا ماشاءاللہ) قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ حوصلے پست ہوگئے تھے۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی۔ عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آگئی۔ شوکت و حشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی۔ نماز، روزہ حج زکوٰۃ۔ مناسک و شعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہد اولیٰ میں تھی۔ لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مترتب ہوتے تھے۔ قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں۔ اور ایسے ایسے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں اگر اس وقت نصیبہ یاوری کرتا۔ ہمارے اعمال کے سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی تو ذہنیتوں

میں یہ اعتقاد پیدا کیا جاتا کہ یہ تمام عبادات ۔ یہ تمام اعمال جن کی شکل اسلامی ضرور ہے اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمال صالح نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہوں ۔ جو عہدِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ میں ہوئے تھے ۔لیکن بدبختی کہ زاویۂ نگاہ اُلٹی طرف بدلا ۔قرآن کریم نے جہاں جہاں کامیابی ۔ فلاح ، سرخروئی ، فوزِ عظیم ، رزق کریم ، حسنِ مآب مومنین کے لیے مخصوص کیا تھا ۔ ان سب کو آخرت کی زندگی سے متعلق کر دیا گیا ۔ اس دنیا کو یکسر دارالعمل اور اُخروی زندگی کو دارالجزا قرار دے دیا گیا ۔ اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رکھا کہ جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے ۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ باوجود عقیدہ کی شدّت اور صوم وصلوٰۃ ۔تسبیح وتحلیل کی پابندی کے دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست　　　یہ مذہبِ مُلّا وجمادات ونباتات

اُس وقت بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا ۔کہ ان الفاظ و اعمال کی روح ان سے مفقود ہو چکی ہے اس لیے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے ۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو یوں اطمینان دے لیا کہ یہ تمام " اعمال " رائیگاں نہیں جا رہے ۔ البتہ ان کا نتیجہ اُخروی زندگی میں برآمد ہوگا ۔غیر مسلم خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے بجائے ان کے کہ ان پر رشک آتا ۔ ان کو اپنے لٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھے ۔ اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ابتلاً کی زندگی ہے جس میں انہیں مہلت دی گئی ہے ۔اُخروی زندگی میں ہم جنّتِ جاودانی اور یہ جہنم ابدی میں جائینگے عیسائی راہبوں کا فلسفۂ ترک علائق ۔یونانی مشائین کی حکمتِ ترک دنیا ۔ہندومت کا سنیاس ۔ بدھ دھرم کا سنسار تیاگ ۔ ایک ایک کر کے اسلامی تمدن میں منتقل ہوتا چلا گیا ۔ لہٰذا ترکِ دنیا ۔ ترکِ علائق ۔ ترکِ لذائذ ۔ حتیٰ کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خط وخال قرار پا گئے ۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　　بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور　　　کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی　　　اگر شکست نہیں تھی تو اور کیا تھی شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ

نظامِ انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی حالت سے محترز رہنے کے لیے تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں ایسی زندگی کو ہی نصب العین حیات نہ سمجھ لینا۔ یہ دنیا اور اس کی متاع سب عارضی ہے تمہاری منزلِ مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآن کریم میں ایسی تعلیم تھی۔ اُسے دنیا دی متاع دانیا سے نفرت دلانے کے لیے بطور نص صریح پیش کرنے لگے۔ یعنے طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لیے سر پہ برف رکھنے کی تاکید کی تھی۔ کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض پر کرنے لگ گئے۔ دنیا دی زیب و زینت کی چیزوں کو قرآن کریم نے بالتصریح حلال فرمایا تھا۔ وہ سب حرام قرار پا گئیں چیتھڑے پہننا۔ بھوکے رہنا خستہ و خراب ہونا، بے گھر بے در زندگی بسر کرنا" خدا کے بندوں" کی علامات مقرر ہوگئیں۔ غرضے کہ ایک ایک کر کے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزوِ اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں جس کو روکنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ اور جس کو اس نے بدعت قرار دیا تھا۔ (۲۷ : ۵۷)۔ اسلام رہبانیت کا اس لیے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام افراد کی اصلاح اس لیے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ افراد کا تزکیہ نفس ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم مرتب ہوگی وہ خود مزکّی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پرزہ ہے جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے اگر ہر ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ یاقوت اور الماس کے ریزوں پر قائم ہو۔ خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پرزوں سے وابستہ نہ ہو تو اس مشینری کے لیے ایسے پرزے کا عدم اور وجود برابر ہے اس کا فی ذاتہٖ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین ایسی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کو غاروں میں چھپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ ایک ذہنیت کے بدل جانے سے اس تمام تعلیم کی روح بدل گئی۔ اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالم اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے مہلک جراثیم پھیل گئے۔ اور آہستہ آہستہ اسلام کی تمام شوکت و حشمت۔ ذل و مسکنت میں

بدلتی چلی گئی حتّٰی کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف تھا۔ یاس وحرمان کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے۔ اور چونکہ وہی تعلیم جو اس واماندگی۔ ضعف وناتوانی۔ پریشانی وپراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی۔ اصل اسلام بن چکی ہے۔ لہٰذا عوام تو اس نشے میں مست ہیں۔ کہ یہاں جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں۔ جونہی آنکھیں بند ہوئیں اور ہم جنتِ جاودانی میں جا بیٹھے۔ اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب انکی مذہب پرستی کا نتیجہ ہے۔ اسلام سے (یعنی اس اسلام سے جسے اسلام کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے) بے زار ہو جاتے ہیں۔ دین کے علمبرداروں کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں۔ اور بے دین بننے والوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین داران کی دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔ اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے۔ لہٰذا ان دونوں میں ایک ایسی حدِ فاصل۔ ایک ایسی گہری خلیج حائل ہو چکی ہے۔ کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں کو۔ دین اور دنیا کو ناقابل اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ حامیان دین نے اسی وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزت باقی ہے۔ مسلمان غرباء کے طبقہ کی حالت آج خون کے آنسو رُلا دینے والی ہو چکی ہے۔ کاشت کار مسلمان۔ وہ پنجاب کا زمیندار ہو یا یوپی کا مزارع۔ آبادی کا پندرہ آنے حصہ ہے۔ لیکن حالت اس کی یہ ہے کہ ایک آنہ روز اس کی آمدنی کی اوسط نہیں پڑتی (حالانکہ جیل خانے کے قاعدہ کی رو سے ایک قیدی کا سالانہ خرچ بھی نوّے روپے سے کم نہیں ہوتا)۔ لیکن "دین" کی تمام خدمات کا بوجھ اسی غریب ونادار طبقہ کے ذمّہ ہے۔ مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کر کے اسے عذاب قبر اور نار جہنم سے بچنے کی دُعائیں سکھا جاتا ہے۔ شیخ طریقت اپنا ٹیکس لے کر پاس انفاس اور ذکر خفی وجلی سے روحانیت بڑھانے کا "صراطِ مستقیم" دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآن کریم کے رزق کریم اور حیات طیبہ کے وعدوں کو ہمیشہ عاقبت پر اُٹھا کر اُسے تھپک تھپک کر سلا تا جاتا ہے۔ کہ یاد رکھو وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ میں نے ایک بہت بڑی مسجد میں جمعۃ الوداع کے وعظ میں خود سُنا کہ "امام آخر الزماں کا ظہور اس وقت ہوگا جب مسلمانوں کا زوال وانحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گا۔ چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں ان پر چھا جائیں گی۔ امید کی کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں اُلٹا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کا

زوال اس آخری حد تک نہیں پہنچا جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائیگی تو آنے والا آئے گا اور تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہوجائے گی "۔ جو لوگ کچھ آسودہ حال ہیں ان پر ان حضرات کی نظرِ کرم اور قسم کی ہے۔ آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ "ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کردے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیے "۔ ان مقتدیان دین نے اپنے اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے۔ ہزاروں روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرا دئے جاتے ہیں۔ دوسری جماعتوں کے ائمہ و مشائخ۔ علماء و اسلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں مقدمے چلتے ہیں۔ ہزار ہا روپیہ طرفین سے صرف ہوجاتا ہے۔ دینے والے اسے فی سبیل اللہ سمجھ کر جنت کے خریدار بنتے ہیں لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں۔ حالاں کہ غور سے دیکھیے کہ اللہ نے اس سلسلۂ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لیے تخلیق کر کے اسے حضرت انسان کے تابع فرمان کردیا۔ پھر ان انسانوں میں سے امت مسلمہ کو خیر امتہ کہہ کر اس خاص مقصد کی تحصیل کے لیے انہیں چُن لیا تو کیا وہ مقصدِ عظیم وہ نصب العین جو فاطرِ کائنات نے اس اجتباء و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا۔ اس کا حصول اس کا دارو مدار اس بات پر ہوگا کہ نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیے یا باآوازِ بلند، ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ درحقیقت قصور ان کا بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی بنیاد غلط ہے۔ فلاح و سعادت کو محض اخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کردینے سے مطلب ہی یہی ہے کہ یہاں کے اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے۔ بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے۔ یعنے ایمان و اعمال صالح کی پہچان حسنِ مآب نیک انجام۔ کامیاب زندگی۔ حیات طیبہ۔ استخلاف فی الارض نہ ہو۔ بلکہ ان کی سند اس قسم کے سرٹیفکیٹ ہوں جو مصری خلفا کے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا کوئی تبدیلی کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی ؎

نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

آپ اس طبقہ کو چھوڑ یے۔ جو اسلامی مناسک و عبادات پر عامل نہیں۔ اس طبقہ کو دیکھیے جو ان عبادات پر کاربند ہے۔ ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے؟ قرآن کریم نے ان ہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا قد افلح المومنون (۱-۱۱: ۲۳) انہی کے لیے آیا تھا۔ اور اس تاکید کے ساتھ آیا تھا جو قد کا خاصا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے افلح واصلح ہونے کے ناکام و نامراد ہوتے جا رہے ہیں کیا محض اس لیے نہیں کہ یہ کامیابی یہ فلاح و اصلاح محض آخرت سے منسلک کر دی گئی ہے؟ قرآن کریم نے کہا تھا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ - (۴۷:۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے اعمال صالح کئے یعنے ایمان لائے۔ اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے۔ جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے ان سے ان کی برائیاں دور کر کے ان کی حالت کو بہترین بنا دیا جائے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے صالح کہا جاتا ہے اس کی زندگی قابل رحم گزر رہی ہے۔ کبھی سوچا بھی کہ یہ کیوں ہے؟ اور حیرت ہے کہ قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے ارشاد کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام فقط حیات آخرت ہی۔ یہ دنیا نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآن کریم میں ہے:-

"بداعمال لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے کہ ان سب کا مرنا اور جینا۔ حیات و ممات یکساں ہو جائے یہ بہت برا فیصلہ ہے۔ (جو یہ کیے بیٹھے ہیں)" (۴۵:۲۱)

یعنے قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و صالح کی زندگی ایک بداعمال کی زندگی کے برابر نہیں بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہیئے یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اور جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی و گمراہی پر ہے

لیکن کیا واقعی آج ان کی زندگی جنہیں مومن وصلح کہا جاتا ہے ۔ بداعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے واقعات تو اس کے خلاف جا رہے ہیں ۔ قرآن کریم نے تو اعمال وایمان کے صلہ میں رزق کریم ۔ عزت وآبرو کی روٹی (۲۲۰۵۰) دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ پھر آج یہ کیوں ہے ۔ کہ سب سے زیادہ ذلت ورسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے ۔ یہ محض "زیب داستان" نہیں ۔ بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو ذلت وخواری کی وہ منازل طے کرنی پڑتی ہیں جنہیں ایک شریف انسان سن نہیں سکتا ۔ جایئے ! اور بڑے بڑے شہروں میں دیدۂ عبرت سے دیکھئے کہ مسلمانوں کی شرافت ونجابت ۔ عصمت وعفت کن داموں بک رہی ہے اور یہ کسی عیش وطرب کی خاطر نہیں ۔ بلکہ شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ پیٹ کی مجبوریوں کی خاطر ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری زبوں حالی اس لیے ہے کہ ہم نے اسلام چھوڑ رکھا ہے ۔ بجا اور درست ۔ لیکن اس اسلام چھوڑنے کی تفصیل کیا ہے ؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھنے لگ گئے ۔ شکل وصورت سے کرسٹان ہو گئے ۔ ان کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب اسلوب درست اور صحیح ہیں ۔ جو آپ کے معیار کے مطابق پکے مومن ہیں وہ کونسی خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ آپ کچھ ہی کہہ لیجئے ۔ لیکن یہ ساری خرابی اس نظریے کی ہے جو اسلام کے ضعف وانتشار کے زمانے میں پیدا ہوا ۔ اور جس کی رو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا ۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے ۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جگا جگا کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو ۔ دنیا کی ذلت وخواری خدا کا عذاب ہے ۔ یہاں کی شوکت وحشمت کی زندگی ہی عین اسلامی زندگی ہے ۔ مسلمان دنیا میں ایک امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے ۔ عزت ووقار جاہ وسطوت ۔ سربلندی وسرفرازی ۔ اس کے اعمال صالح کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں ۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت اسلامی ہو تو ہو ۔ ان کی روح ہرگز اسلامی نہیں ۔ جو یہاں ذلیل ہے اور اس ذلت پر قانع ہے وہ آخرت میں کیسے معزز ہو گا جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے ۔ وہ عاقبت کیا سنوارے گا ۔

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷:۷۲) جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا

یقین مانیئے کہ اس تعلیم کی اشاعت میں آپ کی سخت سے سخت مخالفت ہوگی ۔ معتقدات کا چھڑانا افیون

چھڑانے سے کم نہیں ہوتا ہے

گرفتم حضرتِ مُلّا ترشّس اوست　　نگاہش مغز را نشناسد از پوست

اگر با ایں مسلمانی کہ دارم　　مرا از کعبہ می راند حق اوست

لیکن اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ تبدیلی از بس لابدی ہے تو کسی مخالفت کی پرواہ نہ کیجئے۔ کہیے اور برملا کہیے۔ بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت۔ ایک دفعہ اس اسلامی رہبانیت کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آیئے۔ پھر دیکھیے کہ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوٰتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پوچھنا ہی کیا۔ جب خدا کی کتاب زندہ ہے۔ اس کے رسولؐ کا اسوۂ حسنہ زندہ ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اسی قوم کو ہے کہ بعتا للاصلح قانونِ فطرت ہے۔ اور اس قوم کا ہر عمل۔ عملِ صالح ہے جو اس کے اندر زندہ اور پائندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے قرآن کریم کے اسی اصول کو۔ اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ جاریہ کو کہیں سے سن پایا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہو گئے ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ انکے اعمال کی بنیادیں ایمان پر نہ تھیں خشیت باری تعالیٰ۔ تقویٰ اور خدا پرستی ان میں نہ تھی۔ اس لیے انکے اعمال کی ظاہری زینت تو ان کو مل گئی۔ مگر انکی حقیقی لذت سے وہ بہرہ یاب نہ ہو سکے اور تمام ملک عدم اطمینان و فقدان سکون کا جہنم زار بن کے رہ گیا۔ لیکن بایں ہمہ کچھ تغلّب تو حاصل ہوا۔ کچھ تسلط تو مل گیا۔ ناپائیدار ہی سہی تسخیرِ فطرت تو ہوئی۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ:۔

قبضے سے اُمت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ ہو جائیں تو پھر اس جنتِ ارضی کا پوچھنا ہی کیا فی عیشۃ رّاضیہ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گذر ہی نہ ہو۔ جس میں یورپ آج گزر رہا ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یعنے اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے۔ استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں۔

یاد رکھیے جس ایمان و عمل صالح کا جیتا جاگتا۔ زندہ و پائندہ نتیجہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام نہیں۔ جماعت مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں ضابطہ الٰہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رائی نہیں۔ وہ ایمان قرآنی ایمان نہیں۔ وہ اعمال اسلامی اعمال نہیں انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے۔ نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لیے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے باقی فریب نظر ہے۔

زفتر آں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

اور یہ نتائج صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ مسلمان انفرادی زندگی کو چھوڑ کر ملت کے اندر جذب ہو جائے۔ مرکزیت کی زندگی سے یک نگہی پیدا کرے اور احکام الٰہی کی اطاعت کے "جبر" سے "اختیار" کے تمام مراتب طے کرتا ہوا سرفرازی و بلندی کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ ہو۔ .... اس کے سوا کوئی زندگی "مسلمان کی زندگی" نہیں۔

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است ز کارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقش دگر ملت بریزیم کہ ایں ملت جہاں را بارِ دوش است

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگر دو با یکے عالم رضامند دو عالم را بہ دوشِ خویش گیرد

اقبال

حقائق و عبر

کانگرس بے نقاب سابقہ اشاعت میں اسی عنوان کے ماتحت ایک مفصل مضمون شائع کیا جاچکا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ اچاریہ کرپلانی سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بیان کے مطابق کانگرس کا نصب العین ہندوستان میں اس فلسفۂ زندگی کا ازسرِ نو رائج کرنا ہے جسے بھارت ورش کی پرانی تہذیب کہتے ہیں۔ اور جسکے علمبردار گاندھی جی ہیں۔ اچاریہ جی کے اس بیان کے خلاف ہمارے ذمہ دار مسلم قومیت پرست حلقہ سے کوئی آواز نہیں اٹھی جس سے ظاہر ہے، کہ یہ حضرات خود کانگریس کے اس نصب العین سے متفق ہیں مسلم کانگرسی حضرات کے غیر معروف حلقہ میں اسکے متعلق البتہ کچھ تحرک پیدا ہوا ہے۔ اور اس طبقہ کے بعض حضرات کے خیالات ہمعصر مدینہ کی ۵ ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں جنمیں سے بعض کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

(اقتباس از اخبار مدینہ)

مولانا ابوالاقبال محمد جمیل الرحمٰن صدر مجلس احرار سیوہارہ نے مولانا ابوالکلام آزاد، اور خان عبد الغفار کی خدمت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی حیثیت سے ایک کھلا خط لکھ کر ان بزرگانِ کرام سے مندرجۂ ذیل سوالات کئے ہیں :۔

(۱) کرپلانی جی نے کانگرس کے مقصد و مسلک کی جو توضیح کی ہے اُس کی آئینی حیثیت کیا ہے۔ اور کانگریس نے اسے کس تاریخ سے اپنے عقیدۂ سیاسی کا جزو بنایا ہے ؟

(۲) کرپلانی جی نے کانگرس کے موجودہ نصب العین یعنی گاندھی جی کے فلسفہ کی جو وسیع حدود بیان فرمائی ہیں۔ کیا آپکے نزدیک مذہب کی حدود اسکے سوا کچھ اور ہیں، یا مذہب کا کام

بعینہٖ ہی ہے ؟

(۳) کیا آپ آچاریہ جی کے اِس بیان کی روشنی میں کوئی بیان دے سکتے ہیں"۔

حکیم ابُوالاقبال صاحب انبالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

اِس بیان کے بعد علمائے کرام کو اپنا فرض محسوس کر کے مسلمانوں کو مشورہ دینا چاہیئے کہ وہ اب کیا کریں۔ نیز انھیں کانگرس میں باقاعدہ اِس سوال کو اُٹھا کر یا تو کرپلانی صاحب سے جواب طلب کرنا چاہیئے۔ اور یا اگر انکا یہ اعلان کانگرس ہی کا اعلان ہے تو پھر سابقہ فیصلوں میں ترمیم کرانی چاہیئے۔ تاکہ مسلمان آئندہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ کرپلانی صاحب کا بیان مسلمانوں کے لیئے بیحد تشویش و دلازاری کا موجب بنا ہوا ہے جو شکوک مخالفین کانگرس کی طرف سے ظاہر کیئے جایا کرتے تھے۔ ان کو اس بیان نے پختہ کر کے کانگرسی مسلمانوں کو نادم کرنے کا پُورا موقعہ دیدیا ہے"۔

دہلی سے محمد عبدالرزاق صاحب لکھتے ہیں، کہ :۔

"حضرت مولانا ابوالکلام۔ مولانا حسین احمد مدنی مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید صاحبان و نیز دیگر اراکین جمعیت علمائے ہند بغیر کسی تاویل کے جلد از جلد صاف صاف بیان دیں کہ آیا کرپلانی صاحب کے اس بیان کے بعد کانگرسی بننے کے بعد دامنِ رسولِ مدنی بھی ہاتھ میں رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اور اسلامی تمدن۔ معاشرت۔ سیاست و تعلیم اور روحانیت و مدنیت کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو ترجیح دے کر مسلمان بھی رہ سکتا ہے یا نہیں"۔

پیلی بھیت سے مسٹر محمد منیر خاں ممبر کانگریس تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"یہ بیان مسلمانانِ ہند کے واسطے عموماً اور کانگرسی مسلمانوں کے واسطے خصوصاً کھُلا ہوا الٹی میٹم ہے۔ اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے، کہ کانگریس ایک خالص سیاسی جماعت ہے لیکن اچاریہ کرپلانی جی کا یہ بیان ہمارے لیئے تازیانۂ عبرت ہے +

توقع یہ تھی کہ اس بیان کے بعد ہی اراکین جمعیۃ علما، یا حضرت مولانا آزاد مدظلہٗ کا کوئی

بیان مسلمانوں کی پوزیشن صاف اور واضح کرنے کے واسطے شائع ہوگا مگر افسوس ابتک ایسا نہیں ہوا۔ بہر حال اب جو حالات پیش آ رہے ہیں اور مختلف صوبوں میں جو صورتِ حالات نظر آ رہی ہے۔ اُس کی موجودگی میں ان زعمائے گرامیٔ قدر سے با دب استفسار کرتا ہوں۔ کرپلانی جی نے تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی طرف سے اپنا راستہ بتلا دیا۔ لیکن اب مسلمانوں کا راستہ کون سا ہوگا؟ کرپلانی جی کا بیان واقعی کانگرس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے تو پھر یہ کہنا پڑیگا کہ یہ جماعت مسٹر دھاندجی کی شدھی تحریک کا ایک نیا روپ ہے۔

مسٹر تاج الدین۔ بی۔ ایس سی بی۔ ٹی۔ رعلیگ) اپنی بعیت سے کانگرسی حکومتوں کے نظام تعلیم پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"کرپلانی صاحب کے بیان کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ گاندھی جی یا کانگرسی حکومتیں اپنی تعلیمی اسکیموں کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہیں، جسے کسی زمانہ میں اسپارٹا، عیسائی کلیسا اور نپولین نے کیا تھا۔ جاپان، روس، اور جرمنی میں آج کل ہو رہا ہے، یا جس پر اب تک ہندوستان میں انگریز عمل کرتے رہے ہیں، گاندھی جی کا فلسفہ ہندو فلسفہ ہے۔ وہ جس اخلاق و تہذیب و معاشرت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، وہ یقیناً ویدک تہذیب و معاشرت ہے جس کا وہ خود ایک عملی نمونہ ہیں۔ چنانچہ اسوقت جو تعلیمی اسکیمیں کانگرسی وزارتوں کے زیرِ غور ہیں، ان کو دیکھ کر یہ شُبہ با سانی کیا جا سکتا ہے کہ کرپلانی جی کے بیان کے بموجب انکا مقصد گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے مطابق بچوں کی ذہنیت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنا ہے"۔

(اقتباس ختم ہوا)

ایک چیز وضاحت طلب ہے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ "اگر کرپلانی جی کا بیان کانگرس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ..... وغیرہ"۔ کرپلانی جی کانگرس کے جنرل سکریٹری ہیں اور کسی ایک کانگرسی

نے بھی اُن کے بیان کی تردید نہیں کی ۔ اسکے بعد "اگر" کا کیا سوال ہے ؟ مدینہ کے اسی پرچہ میں میرٹھ پولیٹیکل کانفرنس کی روئداد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ کرپلانی جی نے کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ "گاندھی جی کی تعلیمات کو الہامات خداوندی سمجھنا چاہیئے ۔ اور اس لیئے گاندھی جی کا درجہ نائب خدا کا درجہ ہے" ۔ اِن واقعات کے بعد ہمارے "مقتدر" مسلم قومیت پرست حضرات اور "جلیل القدر" علمائے کرام کے لبوں پر مہرِ سکوت جن معانی خیز مصالح کی غمازی کر رہی ہے وہ کسی دیکھنے والی آنکھ سے پوشیدہ نہیں ! اور اسکے باوجود ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم شرکتِ کانگرس سے اور عوام مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیکر اِسلام کی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ خدا اسلام کو ایسے "دوستوں" سے بچائے ۔

گلۂ جفائے وفا نما ۔ جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے !
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ! ہری" !!

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ دائرۂ حمیدیہ (سرائے میر) کے رسالہ الاصلاح کا اگست کا پرچہ نظر سے گذرا ۔ یہ پرچہ بھی کانگرس کی "مولویانہ" حمایت میں پیش پیش رہا کرتا ہے لیکن الحمدللہ کرپلانی جی کے بیان نے اس کی بھی آنکھیں کھول دیں ۔ چنانچہ اس میں زیرِ بحث بیان کی بڑی شدت سے مخالفت کیگئی ہے اور اخیر میں لکھا ہے کہ :-

"ہم مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا حسین احمد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمائیں کہ اگر کانگریس یہی ہے تو دونوں برائیوں میں سے کون اشد ہے ؟ انگریز یا کانگریس ؟ اور "دفاعی قومیت" کا مخترع اور مجہول فلسفہ اتنی کھلی ہوئی ڈکیتی اور ایسی علانیہ خدا عی کے ساتھ اگر "خودکشی" نہیں تو اور کیا ہے ؟

اس مضمون کی روح اگر اچاریہ کرپلانی کے اندر گاندھی جی کے اندر سے آئی ہے ۔ اور ہندو لیڈروں کی عام ذہنیت یہی ہے تو ہندوستان کا دو حصوں میں تقسیم

ہونا قطعی اور لازمی ہے ۔ اور اس کی ذمہ داری ان ہندو لیڈروں کے سر ہوگی جن کو اکثریت کے گھمنڈ ۔ انگریزوں کی تائید کے اعتماد اور مسلمانوں کے انتشار نے بالکل مخبوط کر دیا ہے ۔ بے شبہ مسلمان آج منتشر ہیں ۔ لیکن کرپلانی جی کے اس طرح کے مضامین ان کو مجتمع بھی کر دیں گے ۔ اور اس وقت کرپلانی جی دیکھیں گے کہ مسلمان اپنے اوپر گاندھی کے فلسفہ کو مسلط ہونے سے کس طرح روک دیتے ہیں اور ان میں اپنے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کے لئے متحدہ ہو کر مرنے اور مٹنے کا کتنا جذبہ ہے ۔"

یہ ہیں مہاتما! بمبئی کی کانگریسی حکومت نے گاندھی جی کی ہدایت کے ماتحت امتناع شراب کا قانون رائج کر دیا ۔ اس کے بعد گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ شراب کے ساتھ سٹہ، قمار بازی سینما ۔ گھوڑ دوڑ کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی ۔ آپ ہریجن میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"اگر میں قمار بازی کے خلاف مہم شروع کر دوں تو خطرہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ہاتھ سے کھو دوں گا جو میری مستقل طور پر روپے سے امداد کرتے ہیں ۔ اگر گھوڑ دوڑ کے خلاف جہاد کروں تو امراء سے لے کر معمولی آدمی تک میرے خلاف ہو جائینگے اگر سینما کے خلاف تحریک کی جائے تو اس سے بقول بعض اشخاص کے تعلیمی اور اخلاقی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے ۔ اگر میں ان تمام برائیوں کو بھی وہی حیثیت دوں جو شراب کو دی گئی ہے ۔ اور ان کے خلاف پکٹنگ کا انتظام کروں تو میری مہاتمائی ختم ہو جائے گی ۔ اور کیا عجب کہ میں اپنے سر کو بھی ضائع کر دوں جس کی اس عمر میں کوئی زیادہ حیثیت نہیں ۔ چونکہ میں ان ہمہ گونہ نقصانات کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ۔ اس لئے مجھے خط لکھنے والے بیشک یہ کہتے پھریں کہ میں اپنے فرائض کا احساس نہیں کر رہا ہوں ۔ میں ان برائیوں کو جانتا ہوں ۔ مجھے امید ہے کہ مجھ سے زیادہ مصلح ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے ۔ میرے

لیے یہی اقدام کافی ہے جو کیا جا چکا ہے"۔

چندہ! مہا تما جی! کس قدر کشش کے سامان اپنے اندر رکھتے ہیں کہ ان کی قیمت پر ان برائیوں کے استعمال کی کوشش۔ جنہیں یہ خود برائیاں تسلیم کرتے ہیں مصلحت بینی کے خلاف ہے باقی رہا سر جانے کا سوال۔ تو یہ تو محض برائے بیت لکھدیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ سٹہ اور قمار بازی روکنے میں جان کا خطرہ چہ معنی! البتہ حضور وائسرائے کی خفگی یقیناً ایسی چیز ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

اب بات سمجھ میں آئی کہ بمبئی میں امتناع شراب کی "جرأت" کیوں کی گئی تھی۔ شراب کی بندش میں اقتصادی نقصان عام طور پر پارسیوں کا ہوا۔ اور حکومت کو جو خسارہ ہوا اسے جائیداد پر ٹیکس لگا کر وصول کر لیا گیا۔ جس میں پھر مسلمانوں اور پارسیوں ہی کا زیادہ حصہ تھا۔ "مہاتما جی" نے خدمت خلق کی نیک نامی بھی حاصل کر لی۔ اور ہندوؤں کے مفاد بھی محفوظ رہے۔ یہ ہے "بنیا بدھی"۔ دیوی کے درشن اور رکھاٹ کا بیوپار! اسے کہتے ہیں۔

الکفر ملۃ واحدۃ

ڈاکٹر مونجے نے البرٹ ہال۔ کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مہاسبھا جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے اس کا نصب العین یہ ہے کہ

(۱) ہندوستان کی آبادی میں پھر سے ہم رنگی پیدا کی جائے۔ مذہب۔ نسل۔ کلچر ہر شے میں ہم رنگی

(۲) تبدیلی مذہب کی ہر ممکن ذریعہ سے ممانعت کر دی جائے ذاتی کوششوں سے یا بذریعہ قانون۔

(۳) بنگال سے "حق منسٹری" کو ختم کر کے اس کی جگہ ایسی حکومت قائم کی جائے جس کا وزیر اعظم ہندو ہو۔ (اسٹیٹسمین ٹائمز ۹/۹/۳۹ ۸)

مذہب۔ کلچر وغیرہ میں یکرنگی پیدا کرنے کے لئے آپ اچاریہ کرپلانی کا بیان پڑھ چکے

ہیں جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کانگریس تحریک کا نصب العین ہی یہی ہے ۔ کہ ہندوستان میں پھر سے قدیم آریائی تہذیب اور مذہب کی ترویج کی جائے ۔

تبدیلیٔ مذاہب کے خلاف یالواسطہ مولانا ابو الکلام صاحب آزاد اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں کافی تبلیغ فرما چکے ہیں ۔کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق جب عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں تو پھر ایک مسلمان کو کیا حق حاصل ہے کہ کسی ہندو کو یہ کہہ کر دعوتِ اسلام دے کہ دنیا میں سچا مذہب یہی ہے ۔چنانچہ گاندھی جی نے ان کی تفسیر کے حوالہ سے تحریک تبلیغ کے خلاف یہی دلیل پیش کی تھی ۔ مولانا آزاد کی مساعی حسنہ کی تکمیل واضعین واردھا اسکیم نے فرما دی جس میں "قومی تعلیم"، کا سنگ بنیاد ہی یہی نظریہ قرار دیا گیا ہے ۔ زمین یوں تیار کر دی گئی ہے ۔اب فیڈریشن کے بعد اس قسم کا قانون نافذ کر دینا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا ۔جب تک مسلم نیشنلسٹ حضرات کا عنصر ہندوؤں کے ساتھ ہے انہیں اس قسم کی تدابیر کے بروئے کار لانے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی ۔

اب رہا "حق منسٹری" کا انہدام ۔ اور اس کی جگہ ہندو منسٹری، کا قیام ۔ سو اس کے لئے کانگریس پہلے ہی سے کوشاں ہے ۔ اور اس "کارِ خیر" کی تکمیل کے لئے بھی مسلمانوں کی کمی نہیں ۔جن حضرات کی تگ و دو آسام میں "سعد اللہ منسٹری" کی جگہ "ہندو منسٹری"، قائم کرا سکتی ہے ۔بنگال میں وہ کیوں پیچھے رہیں گے ۔

اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے نصب العین اور منتہائے نگاہ میں کچھ بھی فرق ہے ۔اور مسلمانوں کی تخریب کے لئے مسلم نیشنلسٹ حضرات کی "مساعی حسنہ" اور مونجے اور ساورکر کی تدابیر میں کچھ بھی اختلاف ہے ؟

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

بانیٔ تحریکِ پاکستان

پاکستان ملی تحریک کا چرچہ مدت سے ملک کے اطراف واکناف میں ہو رہا ہے اور تقریباً تعلیم یافتہ اور اخبار خواں متنفس اس اسلامی ریاست کے نظریے سے روشناس ہو چکا ہے "پاکستان" کا نام آج اس قدر زبان زدِ خلائق ہے کہ اس لفظ کے معنی ہر اس علیحدگی کے مترادف سمجھے جانے لگے ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے مطلوب ہے۔ اس تحریک کی اہمیت اور صداقت کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ پنجاب کے تمام مسلم اخبارات نے پاکستان اسلامی ریاست کے مطالبے کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت بھی اس کی پشت پر ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے بہت سے شہروں میں پاکستان کے نام پر مجالس بھی کھل گئی ہیں۔ لیکن ابھی تک ملتِ اسلامیہ اس تحریک کے بانی اور صدر چودھری رحمت علی صاحب کے حالات سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے جنہوں نے اس شہرۂ آفاق تحریک کی پرورش اور اشاعت جان ومال کی قیمت سے کی ہے اور صبر آزما محنت اور شبانہ روز کی کوشش سے اسے زوال اور انحطاط کی چیرہ دستیوں سے بچایا ہے۔ کسی خبر تھی کہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا پیغام جو صدا بہ صحرا ہو کر رہ گیا تھا انگلستان سے پھر براڈکاسٹ (Broadcast) ہوگا اور چند ہی سال میں ہوا اور روشنی کی طرح کرۂ ارض کے طول وعرض میں پھیل جائے گا۔ سوائے رب ذوالجلال والاکرام کی شانِ خسروانہ کے اور کون اس کا حقیقی ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

چودھری صاحب کا وطن مالوف ضلع ہوشیار پور (پنجاب) ہے۔ آپ اپنے علاقہ کے با اقتدار زراعت پیشہ خاندان سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں آپ نے کالج کے نوجوانوں کی تنظیم اور اتحاد کے لیے متعدد انجمنیں بنائیں اور کالج کی بہبود اور تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہی دنوں میں آپ کا تعارف علامہ ڈاکٹر اقبال رحمہ سے ہوا جن کی شفقت کا چودھری صاحب کو اب تک بجا ناز ہے۔ بی۔ اے کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کی لیکن سرکاری ملازمت سے

احتراز کیا تاکہ ان کی فطری آزادی میں کوئی چیز مخل ہو کر اُن کی زندگی کو دوسرے قالب میں نہ ڈھال دے۔ آپ کو علم کی تکمیل اور سیاحت کا شوق بدستور تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں آپ عازمِ انگلستان ہوئے اسی سال حضرتِ علاّمہ نے اپنے فقید المثال خطبۂ صدارت (الٰہ آباد) میں ملّتِ اسلامیہ کو اس نظریہ سے رُوشناس کرایا جس کی بُنیاد پر بعد میں پاکستان کی تحریک قائم ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب حضرتِ علاّمہؒ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (Round Table Conference) میں لندن تشریف لیگئے تو چودھری صاحب نے کیمبرج (Cambridge) میں حضرتِ علاّمہؒ کے نظریہ کو تحریکِ پاکستان کی شکل میں پیش کیا۔ اُس وقت سے آج تک آپ نے اکتسابِ علم کے ساتھ ساتھ پاکستان کا پروپیگنڈا بھی جاری رکھا ہے۔ ان نامساعد حالات میں جبکہ فضا غیر مُلکی ہو اور تعلیمی مصروفیتیں بھی ہوں اور سیم و زر کا ذخیرہ بھی وافر نہ ہو۔ پاکستان جیسی انقلاب آفریں تحریک کی پیہم نشر و اشاعت کرتے رہنا اور اُسکے حق میں فرنگستان کے بیشتر اخبارات سے خراجِ تحسین حاصل کرنا۔ قوتِ ارادی اور جوشِ عمل کی حیرت انگیز مثال ہے۔ انگلستان۔ آئرستان۔ جرمنی اور فرانس کے متعدد ذی اثر اخبارات نے تحریک پاکستان کو ایک جائز درآئینی مطالبہ قرار دیکر اس کی حمایت کی ہے۔

چودھری صاحب نے کیمبرج کی یونیورسٹی سے ایم۔ اے (انگلش) اور ڈبلن یونیورسٹی سے بی اے۔ ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ کچھ عرصہ سے آپ فارغ التحصیل ہیں مگر آپ ایک کتاب "پاکستان ملی تحریک" کے نظریہ اور دستور العمل پر لکھ رہے ہیں۔ گزشتہ موسم بہار میں آپ انگلستان سے بوسٹن (Bostan) امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ غالبًا نومبر میں پاکستان تشریف لے آئینگے۔ اُس روز انشاءاللہ پاکستان کی کامرانی کا ماہِ مُبین اپنی پُوری درخشانی کے ساتھ طلوع ہوگا۔

چودھری رحمت علی صاحب میں فطرت کی کرم گستری سے وہ تمام اوصاف بطریقِ احسن موجود ہیں، جنکا ایک "لیڈر" میں ہونا لازمی ہے۔ اخلاص (Sincerity) ہر نیکی اور خوبی

کی جڑ ہے۔ جو کام بھی اسکے بغیر ہو گا۔ اُس کی بُنیا دنقش بر آب ہو گی۔ جوشِ عمل۔ جرأت مردانہ ثبات اور ایثار۔ فیروزمندی اور کامرانی سب اِسی کی فروعات سے ہیں۔ چنانچہ اخلاص چودھری صاحب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ آپ میں اسلام کی پرستاری اور خدمت کا جذبہ "جنون" کی حد تک ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ جب تک کسی بات کا جنون نہ ہو۔ راستے کی دشواریاں اور صعوبات۔ مخالفین کی شرانگیزیاں۔ اور منافقین کی فتنہ پردازیاں مسخر نہیں ہوسکتیں۔ لیڈر کا بڑا کمال یہ ہے کہ اُس کی گفتار اور کردار میں تفاوت نہ ہو اور وہ جماعتوں کی تنظیم کر سکے، اور اُمورِ انتظامیہ میں کما حقہٗ مہارت اور فطری دلچسپی رکھتا ہو جو سالار اپنے کارواں کی ضروریات اور کوتاہیاں نہیں سمجھتا اور اس کی اصلاح اور غمگساری نہیں کرتا وہ اپنی جماعت کا کامیاب پیشوا نہیں ہوسکتا۔ انسانی فطرت کی شناخت اور جذبات صحیحہ کا واجب احترام ایسی صفتیں ہیں جو لیڈر کو ہر دل عزیزی کا تاج پہناتی ہیں جو لیڈر اپنی جماعت سے اپنی اولاد کی سی محبت کرتا ہے۔ اور جو عفو اور درگذر کے اُصولوں پر کاربند ہوتا ہے وہ اپنے متبعین سے خون کا آخری قطرہ تک خوشدلی سے طلب کرسکتا ہے۔

آج ہمیں ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو اسلامیات کو ہر شئے پر ترجیح دے اور جو اپنی قوم کی نجات اور سلامتی سایۂ رحمت اللعالمین میں دیکھے جو افراط وتفریط سے اپنا دامن بچائے جو ہر مسئلہ کا اسلام کی روشنی میں تجزیہ کرے جسکا ہر قدم قرآنی نصب العین کیمطابق رہے۔ جو کسی کے سینہ پر کابوس بنکر نہ بیٹھ جائے، بلکہ خورد و کلاں سے شفقت سے پیش آئے اور اُنہیں آزادانہ رائے زنی کی جرأت دلائے جو پُر اسرار اور ناقابلِ تقلید زندگی بسر نہ کرے۔ اور جو کسی طاقت اور شخصیت سے مرعوب نہ ہو اور جسکا سر سوائے ذاتِ بے ہمتا کے کسی کے سامنے خم نہ ہو۔ جسکے دل میں اسلام کا عشق اور جس کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت ہو۔!

چودھری رحمت علیصاحب نے انگلستان کی غیر اسلامی فضا کے حصار میں رہ کر اپنے

قلب و دماغ کو ہر غیر اسلامی عنصر سے محفوظ رکھا ہے اور مذہبی روایات کی سختی سے پابندی کی ہے۔ آپ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو ہمیشہ راست بازی۔ اسلام دوستی کفایت شعاری اور ایثار کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ البتہ آپ نازک مزاج۔ سہل نگار اور زنانہ خصلت کا مظاہرہ کرنے والے نوجوان کی سخت مذمت کرتے ہیں جو لوگ ایفائے عہد نہیں کرتے۔ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ مکر و فریب سے کمال اور تفوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہرگز چودھری صاحب کے نزدیک لائقِ ستائش نہیں ہیں۔ خواہ وہ قارون سے زیادہ خزانے اور چنگیز سے زیادہ قوت رکھتے ہوں۔

ہمیں ایسے لیڈر کی ضرورت نہیں ہے جسکے قول و فعل میں تضاد ہو جو سیم و زر پر حریص ہو جو نام و ناموس کے گلی کوچوں میں گداگری کرتا پھرے۔ جو مشرق و مغرب کے علوم سے تہی داماں ہو جو قوم کے جوش اور وفا کا ناجائز استعمال کرے جو اپنے لیے ہر طرح کا سامان تعیش فراہم کرے۔ خواہ قوم بیچاری مفلوک الحال اور قرضہ کے بارسے خمیدہ کمر ہو۔ ہم "ابن الوقتوں" سے بیزار ہیں جو ایک بات پر قائم نہیں ہوتے اور جنکا نصب العین گرگٹ کی طرح بدلتا رہتا ہے ہمیں ایسا لیڈر درکار ہے جس کی فطرت فولاد کی سی مضبوط ہو۔ جسے ہم خیر و عافیت کا ضامن قرار دے سکیں اور جو تمیز بندہ و آقا کو فسادِ آدمیت سمجھے۔

چودھری صاحب تعلیم نسواں کے زبردست حامی ہیں مگر اُس آزادی کے قائل نہیں جو عورتوں کو بارگاہِ مغرب نے عطا کر رکھی ہے اور جس پر اب یورپ خود پشیمان اور نادم ہے بلکہ اس صحیح آزادی کے مبلغ ہیں جو عورت کو بارگاہِ قرآن سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جس میں دُنیا اور عاقبت کی سرخروئی کا راز پنہاں ہے۔

پاکستان کی زبان کے متعلق چودھری صاحب کی رائے ہے کہ اُردو اس کی مُلکی اور قومی زبان ہونی چاہئے اُن کا خیال ہے کہ اُردو زبان ہندوانہ تعصب اور بے انصافی کی نذر ہو کر ہندوستان سے ملک بدر ہو جائیگی اور اپنے قدیمی وطن اور جائے پیدائش پاکستان میں مراجعت کر آئے گی جہاں اُسے ہم اپنی انجمنوں کی شمع

بنائیں گے چودہری صاحب خالص عشقیہ شاعری۔ یا دہ گوئی۔افسانہ نویسی اور ادب لطیف یعنی "ٹیگورانہ" ذہنی گورکھ دہندوں کو پسند نہیں کرتے۔ اُنکا عقیدہ ہے کہ جو قلم یا زبان ملت اسلامیہ کی تعمیر میں معاون نہ ہو وہ ہرگز لائق تحسین نہیں ہے۔

قارئین کرام چودہری صاحب کی تعلیمی زندگی سے یہ قیاس نہ فرمائیں کہ چودہری صاحب محض ایک گرم جوش انسان ہیں جو گرمی خون اور زور بازو سے ایک ناممکن چیز کے درپے ہورہے ہیں اور اُنکا ذہن دانش اور فراست سے خالی ہے۔آپ کی عمر اسوقت تقریبًا پنتالیس 45 سال ہے اور یہ عمر وہ ہے جس میں بالعموم انسان کے عزم اور استقلال میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے، آپ نے تحریکِ پاکستان کا پروگرام نہایت متانت اور سنجیدگی سے تیار کیا ہے اور اس تحریک کے خلاف ہر اعتراض کا جواب آپ کے پاس مع دلائل اور اسناد موجود ہے۔

آپ کشیدہ قامت ہیں۔ بدن کچھ ہلکا ہے۔ خط وخال اور لباس سے سادگی ٹپکتی ہے لیکن جب آپ گفتگو کرتے ہیں تو اس قدر اثر میں ڈوبی ہوتی ہے کہ سیدھی دلمیں اُتر جاتی ہے آپ کے کلام میں شاعروں کی نزاکت اور ادیبوں کی سی شیرینی تو نہیں مگر لب ولہجہ میں سپاہیانہ اور مجاہدانہ انداز ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اُن کی مضطرب روح اور بے چین دل کی ترجمانی صحیح انداز میں کرتی ہوا در سننے والے کو اُن کی صداقت کا قائل کر دیتی ہے۔ آپ صاحب قلم بھی ہیں، مگر بحث ومباحثہ کے لیۓ آپ کے پاس فرصت کم ہے۔ نکتہ چین، کج رو۔ آرام طلب، خودغرض۔ فضول گو عیش پرست اور بد اعتقاد سے یوں دامن بچاتے ہیں گویا وہ خاردار جھاڑیاں ہیں۔ جن سے حتی الامکان کترا کر نکلجانا ہی دانش اطواری ہے۔

ڈبلن آئرستان کے اخبار "آئرش انڈپنیڈنٹ" (Irish Independent) کے مُدیر نے چودہری صاحب سے پاکستان کے سلسلہ میں مُلاقات کی اُسکے تاثرات ہمارے بیان کی وضاحت کے ساتھ تائید کرتے ہیں :-

"اولین نگاہ میں مجھے معلوم ہوگیا کہ مسٹر رحمت علی ایک خوشگوار اور دل کش شخصیت کے مالک ہیں وہ طبعاً ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، وہ انگریزی نہایت روانی اور بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ مگر اُن کی فطری مناسبت زبردست' جذبۂ قومیت کی وجہ سے اپنی مادری زبان "اردو" سے ہے جسکے ساتھ اُنہیں والہانہ دل بستگی ہے جو ہم میں سے اکثر لوگوں کو اپنی مادری زبان "آئرش" سے بھی نہیں ہے۔ وہ بے پناہ جذبۂ حب وطن (پاکستان) کے زبردست مبلغ ہیں جس کی بنیاد مذہب پر ہے۔

مَیں نے کافی عرصہ مسٹر رحمت علی کی معیت میں گذارا ہے۔ اُنکا شمار اُن باایمان لوگوں میں سے ہے جو اپنے نصب العین کی مذہبی شیفتگی سے پرستش کرتے ہیں۔

.... یہاں میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اُنکا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ وہ ایک مسلم مسولینی یا نئے چنگیز خاں بنیں یا ازیں قسم آمریت کے داعی ہوں۔ بلکہ اُنکا مقصد محض یہ ہے کہ وہ ملتِ پاکستان کو مجتمع کرکے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہونچائیں۔ غیر مسلموں سے کوئی ناانصافی نہیں ہو گی اور نہ اُس تنگ نظری کو روا رکھا جائے گا جس کی بدولت ہندوستان نے چھ کروڑ اچھوت پیدا کیے"۔

"چودہری صاحب موصوف کی شخصیت میں مشرق اور مغرب دونوں ملے ہوئے ہیں وہ پنجاب کے بی اے، کیمبرج کے ایم اے اور ڈبلن کے ایل۔ ایل۔ بی۔ اور نہایت شستہ مزاج انسان ہیں، مغرب میں جو تعلیم آپ نے حاصل کی ہے اُس نے آپ کے جذبۂ مذہب کو اور تیز کر دیا ہے۔ اب وہ مستقبل میں اپنے آبائی وطن میں واپس تشریف لے جانے اور وہاں جاکر بیش از بیش خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ "

(آئرش انڈیپنڈنٹ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

ایڈیٹر اخبار "ڈیلی ٹیلگراف" لندن نے ۹ ستمبر 1935 کی اشاعت میں پاکستان کا نقشہ شائع کرکے مندرجۂ ذیل شذرہ سپردِ قلم کیا۔

"مجھے چند خوبصورت اور دیدہ زیب پمفلٹ پاکستان ملی تحریک کے بانی اور صدر مسٹر رحمت علی کی طرف سے موصول ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا نام پانچ اسلامی صوبوں پنجاب۔ افغان صوبہ۔ کشمیر۔ سندھ اور بلوچستان سے حاصل کیا گیا ہے۔ پاکستانی قوم ہندوستان کے لیئے فیڈریشن کے نفاذ کو ناپسند کرتی ہے اور اس کا مطالبہ ایک ملّی وطن یعنی پاکستان کا قیام کا ہے جو پاکستانی صوبہ جات پر مشتمل ہو"۔

لفظ "پاکستان" چودھری رحمت علی صاحب کا ساختہ ہے۔ چنانچہ مدیر اخبار موصوف آگے چلکر چودھری صاحب کے لفظوں میں پاکستان کی یوں تشریح کرتا ہے:۔

"پاکستان" کے معنی ہیں "پاک" لوگوں کی سرزمین۔ لفظ "پاک" کا مفہوم انگریزی میں کما حقہٗ ادا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو انسانی زندگی میں مقدس اور پاک ہے مسٹر رحمت علی (جنہوں نے یہ نام وضع کیا ہے) کا خیال ہے کہ لفظ "پاک" پاکستانی قوم کی صحیح روح کا ترجمان اور آئینہ دار ہے"۔

ترکی کی شہرۂ آفاق خاتون خالدہ ادیب خانم نے سیاحتِ ہند کے حالات ایک کتابی صورت میں قلمبند کیئے ہیں۔ اس کتاب کا نام "اندرون ہند" (Inside India) ہے "پاکستان ملّی تحریک" پر آپنے ایک مستقل باب باندھا ہے۔ اُس سلسلہ میں آپنے چودھری صاحب کا ذکر بھی مختصر الفاظ میں کیا ہے جو ہمارے بیان کی تائید مزید ہے۔ فرماتی ہیں:۔

"مسٹر رحمت علی نے اپنی تعلیم انگلینڈ میں مکمل کی ہے۔ جہاں اُنھوں نے کیمبرج اور ڈبلن کی یونیورسیٹوں سے ایم۔ اے۔ اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ آپ ایک قابل قانون داں تھے اور آپ کو سیاسی تاریخ کے تعمیری پہلو میں خاص شغف تھا۔ لیکن آپ نے وکالت کا پیشہ ترک کر کے "پاکستان ملی تحریک" کا اجرا کیا۔ اور اسوقت آپ کی حیات کا غالب جذبہ اور مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل ہے۔ میں نے ملاقات

کے دوران میں محسوس کیا کہ وہ تلخی جو مسٹر رحمت علی کے دل میں ہندو مہاسبھا نیا نہ اور
اسلام دشمنی کی ذہینت سے جوانی میں پیدا ہوگئی تھی، سرگز اُنکے نظریہ پاکستان پر اثرانداز
نہیں ہوئی۔ اور وہ اس تحریک کی بنیاد ہندو کی عداوت پر نہیں رکھتے۔ فی الحال نہیں
کہا جا سکتا کہ یہ تحریک ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے میں کہاں تک عملی طور پر مفید ہو
لیکن ہندوستانی حالات کے غیر جانب دار مبصر کو اسے نگاہ میں رکھنا چاہیئے"

مندرجہ بالا سطور سے چودھری رحمت علیصاحب کا سرسری تعارف قارئین کرام سے کرایا گیا ہے
ممکن ہے ذاتی تعلقات کی وجہ سے (جن کی بنیاد بھی اسی مشترک مقصد پر ہے جو ہم پاکستانیوں کی
زندگی کا نصب العین قرار پا چکا ہے) اس تعارف میں غیر محسوس طور پر اپنے عزیز دوست کی مدحت
سرائی کا پہلو زیادہ نمایاں ہو گیا ہو۔ لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس میں دانستہ کسی مبالغہ کا شائبہ
نہیں۔ بایں ہمہ چودھری رحمت علیصاحب انسان ہیں۔ ہم مسٹر گاندھی کے پیروکاران کی طرح یہ
غلط دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ چودھری صاحب کی ذات ہر نقص اور عیب سے منزہ ہے۔ کیونکہ
معصوم ذات تو صرف انبیاء ہی کی ہو سکتی ہے، البتہ ہمیں ضرور یقین ہے کہ پاکستان کی کشتی کا ناخدا
بننے کی صلاحیت آپ سے زیادہ کسی میں نظر نہیں آتی۔ اور بحیثیت بانی اور صدر تحریک ہونے کے
چودھری صاحب کو اس بات کا استحقاق بھی پہونچتا ہے۔ نیز اس لیئے بھی کہ پاکستان کا نظریہ
جس جلیل القدر ہستی کی نگہ بصیرت نواز کا رہینِ کرم ہے اسکا پیغامِ حیات آفریں چودھری صاحب
کے خون کے ہر قطرہ میں سرایت کر چکا ہے۔ اور اب جو کچھ یہ کہتے ہیں اُس میں الفاظ تو اِنکے ہوتے
ہیں لیکن روح حضرت علامہؒ کی نقاب پوش ہوتی ہے۔

حمید پاک گوجرانوالہ

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

جناب محمد اکرم خاں صاحب مُدیر روزنامہ شمس، ملتان شہر

ابتدائی تعلیم کے نصاب کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ادارۂ اشاعت "مکتبہ جامعہ" کی طرف سے پانچ کتابوں کا ایک سلسلہ شائع ہوا ہے جس کے متعلق اخبارات میں بعض تنقیدی مضمون ہماری نظر سے گزرے اور بعض مقامات سے یہ اطلاعات بھی آئیں کہ مسلمان اس سلسلۂ کتب کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس صورت حال میں ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کتابوں کا خود مطالعہ کر کے آزادانہ طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ مضمون اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔

پانچوں کتابوں کا مشترکہ عنوان "نئی کتاب" ہے۔ پہلی کتاب کو قاعدہ اور باقی چار کو پہلے۔ دوسرے۔ تیسرے اور چوتھے حصے کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس وقت تک ان کتابوں پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر زبان اور مذہب کے پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے علاوہ ان کتابوں کی تعلیمی حیثیت کو بھی پوری طرح جانچا جائے۔ لہٰذا ہم آگے چل کر ان سب پہلوؤں پر الگ الگ بحث کریں گے لیکن قاعدہ چونکہ بنیادی چیز ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل کے ساتھ علیحدہ تبصرہ کیا جائے۔

نیا قاعدہ

نئے قاعدے میں شروع ہی میں پڑھانے والے کو سب سے پہلی ہدایت یہ کی گئی ہے۔

"سارے قاعدے میں حرفوں کے نام نہ بتائے جائیں بلکہ ان کی صرف آواز بتائی جائے جس طرح ہندی میں رائج ہے۔"

یعنی الف بے جیم دال کے بجائے آ ب ج د کی آوازیں بتائی جائیں۔ صرف یہ نہیں کہ حرفوں کے نام شروع میں نہ بتائے جائیں بلکہ سارے قاعدے میں نہ بتائے جائیں گویا اردو کے مروجہ نام بالکل

موقوف کردئے جائیں اور ہندی کی آوازوں کا طریقہ رائج کیا جائے ۔ ہدایت کا آخری ٹکڑا خاص طور پر قابل غور ہے ۔ہندی اور اُردو کی بحث میں ہندی والوں کی طرف سے اُن کے حروف تہجی کی برتری کی بالعموم یہی دلیل دی جاتی ہے کہ ہندی میں حروف کے نام آوازوں کے مطابق ہیں لیکن اردو (اور اسی طرح عربی اور فارسی) میں حروف کے نام صوتی نہیں لہٰذا غیر فطری اور مشکل ہیں ۔اس نئے قاعدے نے ہندی والوں کی اس سطحی دلیل پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ یہ ہے اس نئے نصاب کی بسم اللہ !

حروف تہجی قاعدہ کو مروجہ طریقے کے مطابق حروف تہجی سے شروع نہیں کیا گیا بلکہ تصویروں کے ذریعے لفظ اور لفظوں کے ذریعے حرف پہچاننے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے ۔ یہ جدت چنداں قابل اعتراض نہ سہی لیکن اس سلسلے میں یہ نوٹ خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ

”پہلے پہل ہندی کے عام مستعمل حروف سے روشناس کرایا گیا ہے “

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اردو کی مروّجہ الف بے کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے ۔ایک حصے میں ۲۱۰۰ حرف رکھے گئے ہیں جو ہندی میں عام طور پر مستعمل ہیں ۔ ۴۸ صفحوں کے قاعدے میں ۴۳ صفحے انہی حروف اور ان کے مرکبات کے لیئے وقف کیئے گئے ہیں اور صرف آخری ۵ صفحوں میں ”عربی فارسی کے باقی ۱۴ حرف “ کے عنوان سے یہ حرف اور ان سے مرکّب چند لفظ اور جملے دئے گئے ہیں ۔

متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے حامیوں کی طرف سے حروف تہجی کی یہ فرقہ وارانہ تقسیم بظاہر تعجب انگیز معلوم ہو گی لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ متحدہ قومیت کی بنیا دیعنے جذبۂ وطنیت کو پختہ کرنے کی خاطر یہ تقسیم مناسب سمجھی گئی ہے ۔یعنی بچوں کے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات بٹھادی جائے کہ ہماری زبان میں اتنے حرف ”دیسی“ ہیں اور اتنے ”بدیسی“ گویا آگے چل کر ہماری زبان سے غیر زبانوں یعنے عربی و فارسی کے حروف و الفاظ نکال دینے کی تحریک کے لیے ابھی سے زمین تیار ہو جائے ۔اس وقت تو عربی ، فارسی اور ہندی کے الفاظ اس قدر گھل مل چکے ہیں کہ اُردو تو بجائے خود ، ہندی جاننے والے بھی بالعموم ان کی شناخت نہیں کر سکتے ۔لیکن اس نئے قاعدے نے امتیاز کی یہی بنیاد رکھ دی ہے کہ ایک وقت خود اُردو جاننے والوں میں بھی یہ احساس پوری طرح پیدا ہو جائے ۔

رسم تحریر۔ ہندی میں مستعمل حرفوں کی شناخت کرا دینے کے بعد ایک نقشہ دیا گیا ہے۔ اس میں ان حرفوں سے بنے ہوئے ایسے الفاظ پیش کیے گئے ہیں جن میں اعراب اور حروفِ علت کا استعمال نہیں ہے۔ بعدازاں حروف علت (ا۔و۔ی) کی مشق کے لیے الگ الگ سبق رکھے گئے ہیں۔ ان سبقوں کے اندر رسم تحریر میں چند ایسی انوکھی جدّتیں پیدا کی گئی ہیں جو اصولی غلطیوں کی حدود تک چلی جاتی ہیں

مروّجہ رسم تحریر میں ی کے حرفِ ماقبل پر کوئی اعراب نہ ہو تو یہ مجہول ہو جاتی ہے۔ حرف ماقبل مکسور ہو تو معروف بن جاتی ہے اور مفتوح ہو تو ی پھیلی ہوئی آواز دیتی ہے مثلاً (۱) دیر۔ بیر (۲) پیر تیر (۳) سَیر۔ خَیر۔ اس نئے قاعدے میں حرفِ ماقبل سے بالکل قطع نظر کرکے حرف ی کے اندر ہی مختلف آوازیں نمایاں کرنے کی صورتیں تجویز کی گئی ہیں۔ چنانچہ ان الفاظ کو اس طرح لکھا گیا ہے۔ (۱) دیر۔ بیر (۲) پیر۔ تیر (۳) سیْر۔ خیْر۔ اس میں (۱) کے الفاظ تو صحیح پڑھے جا سکتے ہیں اور کسی حد تک (۲) کے بھی لیکن (۳) کی تحریر اور تلفظ دونوں غلط ہیں کیونکہ محض جزم کے نشان (ْ) کو زبر اور جزم (ـَـْ) کا قائم مقام بنانا بالکل بے جا ہے۔ علاوہ ازیں اس رسم تحریر سے اعراب کا بالکل غلط تصوّر پیدا ہوتا ہے کیونکہ درحقیقت جزم صرف سکون کی علامت ہوتی ہے اور خواہ وہ تحریر میں آئے یا نہ آئے اوپر کے تمام لفظوں میں اسے ی پر موجود سمجھا جائے گا۔

یہی سلوک و کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں بھی حرف ماقبل کو چھوڑ کر خود و کے اندر تمام آوازیں پیدا کی گئی ہیں۔ مثلاً مروّجہ رسم تحریر کے ان لفظوں (۱) کوٹ۔ بول (۲) کُوٹ۔ دُور (۳) کَون۔ دَور کے لیے یہ صورتیں تجویز کی ہیں (۱) کوٹ۔ بول (۲) کوُٹ۔ دوُر (۳) کوْن۔ دوْر۔ ظاہر ہے کہ ان میں بھی (۱) درست پڑھے جا سکتے ہیں (۲) میں تکلّف بے جا ہے اور (۳) بالکل غلط کیونکہ جزم کے ہوتے ہوئے بھی حرفِ ماقبل کی زیر۔ زبر یا پیش و کی آواز کو بدل سکتی ہے۔

ہمزہ اور یائے مجہول کی ملی ہوئی آواز کو عام طور پر اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔ اُٹھیئے۔ کھایئے وغیرہ اس قاعدے میں اُٹھیئے جیسی متصلہ صورت کو تو اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے لیکن کھایئے کی جگہ کھاءے تجویز کیا گیا ہے۔ یہ نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ اس میں ہمزہ کے ذرا آگے پیچھے ہو جانے سے کھایئے

اور لکھائی کا فرق ہی اُڑ جاتا ہے۔

اس جدید رسم تحریر کے متعلق زیادہ لکھنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے بے جا اور ناقابلِ عمل ہونے کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ خود اسی قاعدے میں بھی اس کو پوری طرح نبھایا نہیں جاسکا۔ مثلاً ص ۲۷ پر تیر۔ پیدل۔ ایسا۔ لیسے پر زیر موجود ہے۔ اور قاعدے سے آگے باقی کتابوں میں تو یہ رسمِ تحریر بالکل استعمال ہی نہیں کی جاسکی۔

ذخیرۂ الفاظ۔ بچوں کے ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ پہلے آسان آسان لفظ سکھائے جائیں اور ٹھوس (Concrete) چیزوں سے خیالی (Abstract) چیزوں کی طرف تدریجی ترقی کی جائے لیکن اس قاعدے میں اس نفسیاتی اصول کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے اس کے برعکس تصویروں سے بھی ٹھوس چیزوں کے بجائے خیالی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے مثلاً سب سے پہلے ایک انگلی اُٹھائے ہوئے ہاتھ کی تصویر ہے اور اس تصویر سے "ہاتھ" کا لفظ سکھانے کے بجائے "ایک" کا تصور دلایا گیا ہے۔ تین آدمیوں کی تصویر سے "لوگ" کا خیال پیدا کرایا گیا ہے ناچتے ہوئے مور کی تصویر سے محض مور کے بجائے "ناچ" کا اور گیند کی تصویر سے گیند کے بجائے "گول" کا مفہوم ادا کیا گیا ہے۔

ہندی میں مستعمل حرفوں سے بنے ہوئے جن لفظوں کا نقشہ دیا گیا ہے اس میں لفظ کسی اصول کے ماتحت نہیں چنے گئے۔ چار کالموں میں سے پہلے کالم میں تو تمام لفظ دو حرفی ہیں لیکن باقی تین کالموں میں کوئی خاص التزام نہیں حالانکہ اگر دو حرفی سہ حرفی اور چار حرفی الفاظ بھی الگ الگ کالموں میں دے دئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ لفظ ایسے چنے جائیں کہ خاص حرف کسی کے شروع کسی کے درمیان اور کسی کے آخر میں آئے۔

پھر اس نقشے کے بعد جب ان لفظوں کے استعمال کا سبق آتا ہے تو اس میں بعض نئے لفظ ڈال دئے گئے ہیں۔ مثلاً ڈگر پر چل۔ تٹ پر ہے۔ ڈھب سے دو۔ ان میں ڈگر۔ تٹ اور ڈھب ایسے لفظ ہیں جو نقشے میں نہیں آئے۔

یہ الفاظ معنوی لحاظ سے بھی قابل توجہ ہیں۔ بالخصوص لفظ "تٹ" تو ان میں ایسا ہے جس کے لیے فرہنگ آصفیہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ تب جاکر معلوم ہوا کہ ہندی کا یہ لفظ کنارے یا ساحل کے معنوں میں صرف گیتوں کے اندر استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ذیل میں کچھ اور لفظوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں جو قاعدہ پڑھنے والے بچوں کے لیے یقیناً مشکل ہیں۔

(۱) غیر مانوس ہندی لفظ:- وچن۔ دھنک۔ ڈگر۔ تٹ۔ گاد۔ لابھ۔ واگھ
ناتھ۔ داسی۔ مورکھ۔ دھرتی۔ ڈھور۔ گنو۔
سُدھ۔ دھرم۔

(۲) عربی فارسی کے مشکل لفظ:- ید۔ وگر۔ حالی۔ خاکی۔ ذاکر۔ تاش۔ دائرہ۔

(۳) وہ لفظ جن کا بچوں کو تصوّر دلانا مشکل ہے:- کھٹک۔ جھب۔ بچن۔ شر۔ باس۔ مات۔
یاس۔ لاج۔ ساکھ۔ اثر۔ راز۔ طرز۔ لحاظ۔
فن۔ ثابت قدم۔ رتن۔

نقشے میں ایک لفظ "بدر" بھی ہے معلوم نہیں یہ عربی کا بَدر ہے یا فارسی کا بَدَر۔ بہر کیف دونوں صورتوں میں یہ بچوں کے لیے مشکل ہے۔ خاص طور پر "یاس" کا لفظ تو ایسا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا مفہوم کوئی استاد کسی بچے کے ذہن نشین کیوں کر کرا سکتا ہے۔

تعلیمی پہلو سے تو قاعدے کی یہ حیثیت ہے اس کی زبان کے متعلق بھی کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ باقی رہی اسکی معنوی حیثیت اور خاص خیالات کی اشاعت اس کا ذکر باقی کتابوں کے ساتھ یکجا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نئی کتابوں کی زبان

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگرچہ پانچوں کتابیں اُردو رسم الخط میں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں لفظ "اُردو" کے استعمال سے جان بوجھ کر پہلو بچایا گیا ہے۔ چنانچہ قاعدے

ہیں "ہندی" کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ کتابوں میں "ہندوستانی" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے لیکن کہیں نہیں آیا تو صرف لفظ "اُردو" نہیں آیا۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ دوسرے حصے میں "ہماری زبان" کے عنوان سے جو مضمون دیا گیا ہے اس میں زبان کے متعلق اپنے مقصد کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے:

"ہمارا دیس ہندوستان اور ہماری زبان ہندوستانی ہے ...... ہندوستانی زبان کا جنم بھی سب قوموں کے میل سے ہوا ...... پہلے مسلمان فارسی بولتے تھے اور ہندو پراکرت میں بات چیت کرتے تھے لیکن ایک دوسرے کی نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں نے مل کر ہندوستانی زبان نکالی .... یہ ہمارے دیس کی زبان ہے جیسے ہمیں اپنا دیس ہندوستان پیارا ہے ویسے ہی اپنے دیس کی زبان ہندوستانی پیاری ہے۔"

اس کے بعد سوال صرف یہی رہ جاتا ہے کہ کیا ہندوستانی سے مراد اُردو ہی ہے یا کوئی اور زبان۔ اگر اُردو کے علاوہ کوئی اور زبان مراد ہے تو کیا وہ کوئی موجودہ زبان ہے یا آئندہ چل کر بننے والی کوئی نئی زبان۔ اوپر کے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی کسی موجودہ زبان کا نام ہے لیکن ان پانچ کتابوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ یقیناً کوئی موجودہ زبان نہیں ہے نہ تو وہ اردو ہے اور نہ ہندی بلکہ ان دونوں کو بگاڑ کر ایک نئی زبان کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے۔

زبان کی غلطیاں۔ زبان کا ادبی معیار تو ایک طرف رہا۔ ان کتابوں میں اتنی احتیاط بھی نہیں کی گئی کہ بچوں کے لیے صاف ستھری زبان استعمال کی جائے جو غلطیوں سے پاک ہو مثلاً ذیل کے ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

قاعدہ ص ۱۴۔ ڈھب سے دو۔ ایک شک ہے ص ۲۰ دولا کھ ہے۔

پہلا حصہ ص ۲۸۔ چند اماموں جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ ص ۴۵ بھو و۔ دکنے کی آواز کو انگریزی میں بو و و کہتے ہیں لیکن اردو میں تو بھوں بھوں ہی کہا جاتا ہے) ص ۷۰ اُٹھیں ہو کر مگن۔

دوسرا حصہ ص۲۲ - دیکھو تو جمنا کی دھارا ص۴۷ ایک نوکرنی رکھ لی - ص۲۰ کھسیا کر

تیسرا حصہ ص۵۹ - اب پورا چین ایک دل ہو رہا ہے۔ اگر یہی ایک دلی رہی ۔ ۔ ۔ ص۹۶

سوچ اور بچار۔

زبان کی ناہمواری۔ علاوہ ازیں اُردو کو بگاڑ کر ہندوستانی بنانے کی کوشش میں زبان کی ہمواری بالکل جاتی رہی ہے اور اکثر فقرے بالکل انمل بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں مثلاً:۔

قاعدہ ص۳۳ - مولا کو یاد کر۔ ہری بھجن گا۔

پہلا حصہ ص۲ سارے جگ کا داتا تو ہے۔ مالک تُو ہے آقا تُو ہے۔

دوسرا حصہ ص۱۶ کشمیر ہمارے ہی دیس کے اُتر میں ہے۔ ایسی بہار کی جگہ ہے کہ سب لوگ اُسے دنیا میں جنّت کہتے ہیں۔ ص۱۴۲ علم اور گیان۔

تیسرا حصہ ص۲۴ دیس کی بھلائی کے لیے جان کی بھینٹ دینے میں جو مزا ہے وہ غلامی کی زندگی میں کہاں۔

چوتھا حصہ ص۹ انسان کی خدمت کر کے اپنے بھائیوں کی سیوا کر کے۔ ص۱۴۶ کرشن جی کی تو ساری عمر ظالموں اور پاپیوں کو سزا دینے اور مظلوموں کی مدد کرنے بیتی تھی۔

یہ مثالیں مُشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ اس قسم کے بے شمار نمونے مل سکتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان فقروں میں ہندی کے جو الفاظ بھی آئے ہیں وہ اُردو میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ اور انفرادی طور پر خالص اُردو کے لفظ قرار دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسے فقروں میں جس انداز سے اور جن الفاظ کے ہمراہ استعمال ہوئے ہیں اس سے زبان کی سلاست اور ہمواری باقی نہیں رہ سکی۔

غیر مانوس ہندی لفظ۔ مصنوعی ہندوستانی زبان بنانے کی خاطر ہندی کے بے شمار الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں کہ یہ بات ان کتابوں کا ایک خصوصی امتیاز بن گئی ہے اس قسم کے الفاظ سے پانچوں کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن محض نمونے کے طور پر چند ایک مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں

جن سے ان کوششوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قاعدہ ص۲۹ اشنان کر۔ ص۳۷ دھوپ سے دھرتی تپ رہی ہے۔
ڈھور کے بدن میں لہو نہیں۔ گئو کے تھن میں دودھ نہ رہا۔

دوسرا حصہ ص۱۴ ہندوستان ہمارا دیس دل سے پیارا دیس ہے ...... ہم اس کے داس ہیں۔ ص۱۵ اس کا ہمالیہ پربت سب پربتوں سے بڑا ہے۔ کشمیر میں بارہ ماس ٹھنڈ پڑتی ہے۔ ص۱۶ ہمارا دیس بڑا سندر دیس ہے۔ ص۶۰ اس پکشی میں ایسے کون سے گن ہیں۔ ص۱۹ دنیا کے بندھنوں کو توڑا جائے۔ ص۱۳۰ اسگائی کرلی۔ ص۷۵ پرجا کی سیوا۔ ص۸۴ پتاجی۔ ص۸۵ پرارتھنا۔ ص۸۶ اہنسا۔

تیسرا حصہ ص۲۳ دیس غلام ہو جاتا تو پتی کا جینا بھی کس کام کا تھا۔ ص۴۰ آنگن۔ ص۸۰ پریم کی کیسی پیاری ریت۔ ص۹۰ گیان دھیان۔ ص۱۱۹ دین اور دیس کی سیوا۔

چوتھا حصہ۔ ص۱۳ دیش کی آنکھ کے تارو آؤ۔ ص۴۹ ان گنت۔ ص۱۲۶ راج سیوگ منایا۔ ص۱۴۷ جان کا پنچھی۔ ص۲۱۸ شریمتی کچوری۔ ستیہ گرہ ص۱۴۲ نیوتا۔ ص۱۴۳ امتھرا باسیوں۔

ہندی کے لفظوں کے استعمال میں قوم وطن اور مذہب تک کی موزونیت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مثلاً "سید احمد خاں نے دلی میں جنم لیا"۔ زرتشت کے حال میں ایران کے متعلق لکھا ہے کہ "وہاں کے راجہ نے آپ کا مذہب اختیار کرلیا"۔ اسی طرح زرتشت کے بارے میں لکھا ہے کہ "اسی لڑائی میں وہ شہید ہوگئے"۔ ولیم ٹیل کے ڈرامے کا آخری فقرہ ملاحظہ ہو "ٹیل کی جے۔ زندہ باد ٹیل سوئزرلینڈ کی جے"۔

علمی معیار

ان کتابوں کی زبان کا انداز تو آپ نے دیکھ لیا۔ افسوس یہ ہے کہ علمی لحاظ سے بھی ان کا درجہ بہت پست ہے۔ قاعدے کے متعلق تو تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے لیکن قاعدے کے بعد باقی حصوں کی بھی علمی حیثیت کچھ اچھی نہیں، وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ بعض خاص تبلیغی مقاصد اور خاص سیاسی خیالات کی اشاعت کی خاطر کتابوں کے علمی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

حصہ نظم ۔ نظموں کے انتخاب میں بچوں کی دلچسپی اور ذہنی ضروریات کے بہ نسبت وطن پرستی اور متحدہ قومیت کی تبلیغ کو زیادہ مدِنظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ چند ایک اچھی نظموں کے سوا باقی سب تبلیغی ہیں۔ ان مقاصد کی دُھن میں اشعار کی صحت تک کا خیال نہیں رکھا گیا۔ بعض اشعار کو تو شاید کاتب کے قلم نے زخمی کیا ہے۔ مثلاً :۔

دوسرا حصہ ص۱ ساری دُنیا کے مالک + راجا اور پرجا کے مالک (پہلے مصرع میں "اے" چھوٹ گیا ہے)

چوتھا حصہ ص۲ دُور دُنیا کا مرے دل سے اندھیرا ہو جائے۔ ("دَم" کی جگہ "دل" لکھا گیا ہے)

ص۲۴۹ بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو ("بودھ" لکھنے سے شعر درست ہوتا ہے)

لیکن بعض اشعار میں فی الواقع زبان اور وزن کی غلطیاں موجود ہیں۔ مثلاً :۔

پہلا حصہ ص۱و۲ دعا کے عنوان سے نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

سارے جگ کا داتا تو ہے۔ مالک تو ہے آقا تو ہے

تمام شعر اسی وزن پر ہیں لیکن آخری شعر اس طرح بدل گیا ہے۔

لَو تجھ ہی سے لگاتے ہیں + تیرے ہی گُن گاتے ہیں

دوسرا حصہ ص۱۷ ہندوستان ہمارا دیس + ہندوستان پیارا دیس (پیارا بروزن ہمارا توجہ طلب ہے)

تیسرا حصہ ص۱۹۱ ان کی بولی شانِ خدا ہے + شان نہیں پہچانِ خدا ہے (پہچانِ خدا کی ترکیب دل چسپ ہے)

غلط اشعار کے علاوہ ان نظموں کا علمی و ادبی معیار بہت پست ہے۔

پہلا حصہ ص۲۵ میں کیا ہوں۔

دوسرا حصہ ص۱۳۰ چڑیا چڑے کی کہانی۔

تیسرا حصہ ص۱۰۱ بچّہ اور جگنو

ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو فنِ شعر کی باریکیاں سکھائی جائیں بلکہ صرف اتنا ہے کہ بچوں کے لیے جو نظمیں رکھی جائیں وہ اغلاط سے پاک ہوں اور معیارِ ادب پر پوری اُتریں۔ بچپن میں پڑھی ہوئی نظمیں بالعموم دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا بچوں میں ذوقِ ادب کے صحیح طور پر نشو و نما پانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ نظمیں صحیح اور معیاری ہوں۔

نظموں کی ترتیب بھی حسبِ دل خواہ نہیں۔ لفظی اور معنوی حیثیت سے تدریج کا خیال کم رکھا گیا ہے۔

سیاسی پروپاگنڈہ

حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں میں علمی اور نفسیاتی ضرورت سے زیادہ خاص سیاسی خیالات کی نشر و اشاعت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ سب سے زیادہ زور وطن پرستی پر دیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے حصّے میں "ہمارا دیس" (نظم)۔ دوسرے حصے میں "ہمارا دیس"۔ "سب سے اچھا دیس ہمارا" (نظم) "دیس کی سیوا"۔ تیسرے حصے میں "ہمارا وطن" (نظم)۔ چوتھے حصے میں "جاگو اور جگاؤ" (نظم)۔ "ہماری دعا" (نظم)۔ "حبّ وطن (نظم) تو سب کے سب مخصوص طور پر اسی مقصد کے

لیے ہیں ۔ان کے علاوہ ضمنی طور پر جابجا دیس اور وطن کا ذکر آتا ہی رہتا ہے خاص طور پر نثر میں تو زیادہ تر دیس ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔البتہ نظموں میں کہیں کہیں وطن بھی آگیا ہے ۔

وطن پرستی کے بعد آزادی کا جذبہ اُبھارنے کے لیے ذیل کے سبق خاص طور پر دئے گئے ہیں تیسرا حصہ ۔ آزادی کی لڑائی ۔موت کا ڈر۔ دیس کا سپاہی ۔ چوتھا حصہ ۔ ولیم ٹیل ۔ بہادر جون ۔امریکہ کی آزادی ۔لیکن یہ نہیں کہ بہادری اور جنگ آزمائی کی رغبت دلائی گئی ہو ۔صرف دوسرے حصے میں ایک سبق " زرگل " کے سوا جس میں ایک سرحدی بہادر کا ذکر ہے باقی سب جگہ گاندھی جی کی " اہنسا " کی تبلیغ کی گئی ہے ۔

متحدہ قومیت کے لیے زمین تیار کرنے کی بھی بہت کوشش کی گئی ہے ۔جابجا اس کے اشارات کے علاوہ تیسرے حصے میں " ہندو مسلمان بھائی بھائی " اور " آؤ مل کر گائیں گیت " نظم اس مقصد کے لئے مخصوص ہیں ۔متحدہ قومیت کی خاطر جن لطائف الحیل سے کام لیا گیا ہے اس کا ذکر ہم آگے ذرا تفصیل سے کریں گے

چرخے اور کھدر (کھادی) کے پرچار کے لیے نہایت باضابطہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے ۔ یعنے پہلی کتاب میں " کپاس " کے عنوان سے ایک باتصویر سبق دیا گیا ہے ۔اس کا آخری جملہ یہ ہے ۔

" کھدر ہمارے دیس کا اچھا کپڑا ہے کھدر پہننے سے ہمارے دیس کی بھلائی ہو گی ۔"

دوسرے حصے میں " کپاس کا کھیت " تیسرے حصے میں " روئی کا کارخانہ " اور چوتھے حصے میں " کھادی گھر " کا ایک سبق دے کر گویا ایک سلسلہ کی تمام کڑیاں مکمل کر دی ہیں ۔

تمدّن اور معاشرت

ہندو معاشرت اور تمدن کو فروغ دینے کی کوشش ان کتابوں کا خاص کارنامہ ہے ۔اسلام یا اسلامی معاشرت کی بابت جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ یونہی برائے بیت قسم کا ہی معلوم ہوتا ہے ۔کیوں کہ اس کا انداز بیان ہی ظاہر کرتا ہے کہ کس قدر ڈر ڈر کر اور بیچ بیچ کر اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی ۔

ہندو معاشرت کی تبلیغ دو طریقوں سے کی گئی ہے ایک بالواسطہ اور دوسری براہ راست۔ بالواسطہ تو اس طرح کہ اُردو کے عام فہم لفظوں کی جگہ ہندی کے ایسے لفظ چن چن کر رکھے گئے ہیں جن سے خود بخود غیر محسوس طور پر ہندو معاشرت کا نقش دلوں پر بیٹھتا جائے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہندی کے الفاظ کی ضمن میں آچکی ہیں۔

دوسرا طریقہ براہ راست تبلیغ کا ہے اس میں وہ فقرے اور مضمون ہیں جن سے عمداً ہندو معاشرت کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ مثلاً چوتھے حصے میں "روٹیوں کا جلسہ" ایک ڈراما ہو جس کے ایک کیریکٹر کو "شریمتی کچوری" کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصے میں کوّے کی کہانی میں اُسے جا بجا "کاگا مہاراج" کہا گیا ہے۔ سلطان ناصر الدین کو درویش بادشاہ کے بجائے سادھو بادشاہ کہہ کر بتایا گیا ہے کہ وہ "مرتے دم تک سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتا رہا"۔ تیسرے حصے میں "بیٹا اور ماں" کے عنوان سے ایک سبق ہے جس میں یہ فقرے قابل توجہ ہیں "جب تو نہا دھو کر بال کھولے اس پیڑ کے پاس مندر کو جاتی" "دوپہر کا کھانا کھا کر جب تو گیتا پڑھنے بیٹھتی" "سب عورتیں تالاب پر جاکر روز کپڑے دھوتی ہیں"۔

ہندو مسلمانوں کی متحدہ معاشرت کا پروپاگنڈہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ ۶۶ "ہندوستان اب ہم دونو کا وطن ہے۔ ہندوستان کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں ... ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون مل گیا ہے ...... دونوں کی صورتیں بدل کر ایک سی ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں"۔

واضح رہے کہ یہ ٹکڑا سر سید احمد خاں کی طرف سے پیش کر کے بظاہر بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے اسی طرح بعض اور مضمون اور نظمیں بھی مختلف اکابر کی تصنیفات سے لی گئی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ خود انتخاب ہی سے "دل کا معاملہ" کھل جاتا ہے۔ جو "رسوائی" کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

متحدہ قومیت کی عملی تعلیم کا غالباً سب سے دلچسپ نمونہ پہلے حصے کے سبق ۲۴ سے ۲۸ میں پایا

جاتا ہے۔ ان پانچوں سبقوں میں مضمون کا ایک ہی سلسلہ چلا گیا ہے۔ شروع میں بتا دیا گیا ہے کہ

"رشید اور ہم ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس کی بہن راشدہ بھی ہمارے ساتھ پڑھتی ہے...

.... کل کی چھٹی تھی تو اسد اور موہن اور سیتا سب رشید کے گھر کھیلنے گئے ....."

دو سبقوں میں ان بچوں کے مل کر کھیلنے کا ذکر ہے۔ ہندو مسلمان بچوں کا اس طرح مل کر کھیلنا تو ایک عام بات ہی لیکن سبق ۲۷ میں معاملہ یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ سب بچے کھانا بھی ایک ہی جگہ مل کر کھاتے ہیں۔ کھانے کا انداز ملاحظہ ہو :-

"چلو بچو کھانا آگیا۔ اماں نے چوکی پر رکابیاں رکھ دی تھیں۔ کٹوروں پر پانی رکھ دیا تھا۔ سب کے لیے الگ الگ ایک کٹورا تھا۔ ابا نے بتایا تھا کہ ایک ہی کٹورے میں سب کو پانی نہ پینا چاہیئے۔ اس سے کبھی کبھی بیماری پھیلتی ہے ....

اماں نے بڑی سی رکابی میں کھچڑی نکالی اور لا کر چوکی پر بیچ میں رکھ دی.... ایک پیالی میں گھی لاکر رکھ دیا۔ ایک میں دہی۔ موہن نے کہا "گھی تو بہت اچھا ہے۔ کیسا پیلا پیلا صاف ہے"..... سب نے دہی اور گھی ملا کر خوب کھچڑی کھائی۔ اسد نے کہا "چٹنی ہوتی تو بڑا مزا آتا" اماں نے کہا "جلدی میں لانا بھول گئی۔ ہرے پودینے کی چٹنی بنا رکھی ہے"

یقیناً ایک ہندو بچے کا مسلمان گھر میں اس طرح گھل مل کر کھانے میں شریک ہونا عام حالات کے مطابق نہیں ہے اور آرزومندانہ اظہار خیال کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

اسی سبق میں کھانوں کی فہرست بھی قابل توجہ ہے۔ کھچڑی۔ دہی۔ چٹنی چپاتی اور خمیری روٹی کا تو صاف ذکر ہے البتہ گوشت کا نام بالکل نہیں لیا گیا۔ اس کے متعلق فقط اس اشارے سے کام لیا گیا ہے کہ ہڈی کتے کے آگے ڈال دی گئی اور اس نے چبانا شروع کر دی۔

ہندو تمدن کے سلسلے میں پہلے حصے کی نظم "گائے" اور تیسرے حصے کا سبق "تلسی" بھی قابل ذکر ہیں تلسی کے بیان میں تو یہاں تک بھی لکھ دیا گیا ہے کہ :-

" دیکھو کتنے فائدے کی چیز ہے۔ ہندو تو اس کی پوجا بھی کرتے ہیں۔"

ایک ہی فقرے میں کس خوبی کے ساتھ فلسفۂ عبادت کے اسرار کھول کر رکھ دئے ہیں۔

اکابر ہند۔ ان کتابوں میں بچوں کے لیئے ہندوستان کے جن بڑے بڑے آدمیوں کا تذکرہ ضروری خیال کیا گیا ہے ان کا تفصیلی تذکرہ طوالت بے جا کا موجب ہوگا۔ صرف اس فہرست سے نقطۂ نظر کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں۔ گوکھلے مہاراج۔ بی آماں۔ دادابھائی نوروجی۔ حکیم اجمل خاں۔ بال گنگا دھر تلک۔ گننے کو تو تین مسلمان اور تین غیر مسلم اکابر کے نام ہیں لیکن حسنِ انتخاب سیاسی زاویۂ نگاہ کی صاف صاف غمازی کر رہا ہے۔

ایک اور جگہ ہندوستان کے ذکر میں یہاں کی تاریخی شخصیتوں کی فہرست یہ دی ہے۔

"سری کرشن جی۔ رامچندر جی اور گوتم بدھ جیسے مہاتما۔ اشوک اور اکبر جیسے بادشاہ، سرسید۔ مہاتما گاندھی اور ٹیگور جیسے بڑے بڑے لوگ یہیں پیدا ہوئے۔"

تاریخ۔ تاریخ میں جن بادشاہوں کو خاص طور پر چنا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔ سلطان ناصرالدین۔ اکبر بادشاہ۔ سکندر۔ خلیفہ ہارون رشید۔ اشوک۔ ان میں سے صرف خلیفہ ہارون رشید کے سوا باقی سب کی حالات میں وہی تبلیغی انداز نمایاں ہے۔ خاص طور پر سلطان ناصرالدین کے تذکرے میں تو کمال کر دیا گیا ہے۔

مثلاً:۔ "سلطان ناصرالدین مرتے دم تک سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ سچے مسلمان کی طرح خدا کی عبادت میں لگا رہتا تھا مگر راج پاٹ کا کام بہت ہی جی لگا کر کرتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے بادشاہ اس لیے نہیں بنایا کہ آرام کروں بلکہ اس لیے کہ اپنی پرجا کی سیوا کروں۔"

گویا ایک سچا مسلمان تو محض خدا کی عبادت میں لگا رہتا ہے۔ لیکن سلطان ناصرالدین "راج پاٹ" کا کام بھی جی لگا کر کرتا تھا۔ غالباً اس کی یہ خصوصیت سادھو ہونے کے باعث ہوگی۔

بادشاہوں کے علاوہ دوسری شخصیتوں میں سوئٹزرلینڈ کے ولیم ٹیل اور فرانس کی جون آف آرک خاص طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن اسلامی تاریخ کو قریب قریب بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مذہب

معاشرت۔ تمدن اور تاریخ کے بارے میں تو آپ نے ان کتابوں کا انداز دیکھ لیا۔ اب ذرا مذہبی تعلیم کے متعلق بھی دیکھ لیجیے۔ مذہبی پیشواؤں میں سے ان کا حال دیا گیا ہے۔ (۱) حضرت محمدؐ (۲) مہاتما گوتم بدھ (۳) حضرت زرتشت (۴) رامچندر جی۔ (۵) حضرت عیسٰیؑ (۶) سری کشن جی۔

مہاتما گوتم بدھ کا حال بہت اچھے طریقے سے دیا گیا اور ان کی تعلیم کا خلاصہ مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت" زرتشت کے متعلق یہ چیز نمایاں کی گئی ہے کہ اُنھوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو اچھا اور نیک بنا اور ایک خدا کی پوجا کرنا سکھایا" اور فرمایا کہ "بس ایک خدا کو مانو۔ محتاجوں کی مدد کرو اور جانوروں پر رحم کھاؤ"۔ ان کے پیروؤں کے متعلق لکھا ہے "کہ آگ اور سورج کی ان میں بہت عزت کی جاتی ہے"۔ رامچندر جی کا حال معروف عام کہانی کے طور پر ہے۔ حضرت عیسٰیؑ کے حال میں اگرچہ اُن کے نبی ہونے کا کوئی ذکر نہیں لیکن اتنا اشارہ ہے کہ "اُنھوں نے خدا کے حکم سے اچھی اچھی باتیں اپنی قوم کو سمجھانی شروع کیں"۔ انکی تعلیم میں سے صرف یہی چیز انتخاب کی گئی ہے کہ "جو تمہارے ساتھ بُرائی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو۔ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو"۔ سری کرشن جی کے کارناموں کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کا حاصل زندگی یہ بتایا گیا ہے کہ اُن کی "ساری عمر ظالموں اور پاپیوں کو سزا دینے اور مظلوموں کی مدد کرتے بیتی تھی"۔

ان سب کے مقابلے میں رسول پاک صلعم کی سیرت مبارکہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صد درجہ افسوسناک ہے۔ آنحضرتؐ کا ذکر سب سے پہلے تو قاعدے کے اندر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"حضرت محمدؐ غار میں خدا کی عبادت کرتے تھے"۔

کہنے کو تو جھٹ کہا جا سکتا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ لیکن ظاہر ہے کہ بچوں کے دل میں آنحضرت کی قبل از نبوت زندگی کے صرف ایک واقعہ کا نقش بٹھانا جس سے ذہن راہبانہ زندگی کی طرف منتقل ہو اور یوں تعلیماتِ اسلامی کے بالکل منافی اثر قبول کرے کہاں تک حق بہ جانب کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے حصے میں "حضرت محمدؐ" کے عنوان سے ایک سبق ہے تمام سبق میں کسی جگہ بھی

اُن کے رسول یا نبی ہونے کا مطلق ذکر نہیں ۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ "آپ نے چالیس برس کی عمر میں اپنا کام شروع کیا اور ترسیٹھ برس کی عمر میں اس دنیا سے سدھار گئے" لیکن یہ نہیں ظاہر کیا کہ آخر وہ کام کیا تھا۔ آپ کی سب سے بڑی تعریف بس اس قدر کی گئی ہے کہ "مکے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سردار پیدا ہوئے" ساتھ ہی آپ کی "اچھی باتوں" کے ضمن میں یہ لفظ بھی قابل غور ہیں "اس پر دشمن بہت گھبرائے ۔ آپ کو روپے پیسے کا لالچ دیا اور کہا ہمارے سردار بن جاؤ پر یہ خیال چھوڑ دو لیکن آپ نے صاف جواب دے دیا"

آں حضرت صلعم کی تعلیمات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ "اپنی دھن میں لگے رہے کہ خدا کے بندے خدا کو ٹھیک ٹھیک پہچاننے لگیں" تمام سبق میں لفظ "اسلام" سے پوری طرح اجتناب کیا گیا ہے اور اسلام کے پھیلنے کا ذکر ان دلچسپ لفظوں میں کیا گیا ہے ۔

"مکے والوں پر اس مہربانی کا بہت اثر ہوا ۔ اُنہوں نے پرانی برائیوں سے توبہ کی سب نیک ہو گئے اور رہوتے ہوتے عرب کے سب شہروں میں نیکی پھیل گئی"

مختصر یہ کہ اس سبق میں آں حضرت کا تذکرہ عقیدت اور اثر سے بالکل خالی ہے اور بالکل اس طرح ہے جس طرح خاکم بدہن کسی عام انسان کا ہو ۔

پُرانے نصابوں سے مقابلہ

ہم نے تمدن ۔ معاشرت ۔ تاریخ اور مذہب کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا ہے اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتابیں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں ۔ اس لئے دونوں کا خیال رکھا گیا ہے بعض باتیں اسلامی معاشرت کے مطابق ہیں تو بعض ہندوؤں کے رسم و رواج کے مطابق تاکہ دونوں ان سے فائدہ اُٹھا سکیں ۔ لیکن یہ جواب بالکل غیر تسلی بخش ہے ۔ کیوں کہ اول تو اس اصول کے مطابق بھی دونوں کا تناسب برابر نہیں ہے ۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں غیر اسلامی معاشرت کو اسلامی معاشرت کے بہ نسبت بہت زیادہ حصہ دیا گیا ہے ۔ دوسرے آجکل ہندی کی طرف ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی توجہ کو دیکھتے ہوئے اس میں بھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ اُردو رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابیں ہندوؤں میں رائج

بھی ہوسکیں گی۔ بالفرض ہندو بچے انہیں پڑھیں بھی سہی تو ان کی معاشرت اور تمدن کی ان میں بہت کافی رعایت رکھی گئی ہے اس کے برعکس مسلمان بچوں کے لئے ان میں بہت کچھ مضرت رساں مواد موجود ہے۔ اگر یہ کتابیں زیادہ تر صرف مسلمان بچوں ہی میں رائج رہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے ہماری آئندہ نسل کو کس قدر نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

اگر اردو نصاب صرف ہندو بچوں کے لئے مقصود ہے تو یہ مکتبۂ جامعہ کی کتابیں ذرا سی کمی بیشی کے بعد ان کے لئے بہت موزوں ہوسکتی ہیں۔ اگر صرف مسلمان بچوں کے لئے چاہئے تو اس سے بالکل مختلف قسم کے خالص اسلامی سلسلۂ کتب کی ضرورت ہوگی لیکن اگر ایسا نصاب درکار ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بچوں کے لئے موزون ومناسب ہو تو وہ خالص تعلیمی بنیادوں پر تیار ہونا چاہئے۔ اس کی زبان بالکل لسانی اصولوں کے مطابق ہو اور ہندی اور اردو کو ملانے کی مصنوعی کوشش سے پوری طرح اجتناب کیا جائے اسی طرح مذہبی اور معاشرتی اختلافات کو خواہ مخواہ درمیان لانے کی بالکل ضرورت نہیں صرف مشترک اخلاقی باتیں اور معلومات عامہ کافی ہوسکتی ہیں چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد۔ اور ماسٹر پیارے لال کا تیار کیا ہوا سلسلۂ کتب اس کی بہترین مثال ہے۔ اس طرح کی مشترک درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں کے بچوں کے لئے الگ الگ مذہبی اور معاشرتی نصاب مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ جو ان کو اپنے اپنے طریق پر تعلیم بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ سرے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت کے فرق سے انکار کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان دونوں معاشرتوں کے امتزاج سے ایک متحدہ "ہندی معاشرت" پیدا کرنے کو نصب العین بنالیا گیا ہے۔

مولانا آزاد اور ماسٹر پیارے لال کے سلسلۂ کتب کا ذکر کرتے ہوئے یہ نکتہ واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت ان کی قومی روایات اور تاریخ کے سبق موجود ہیں۔ ایک طرف سلطان سبکتگین کا ذکر ہے تو دوسری

طرف رانا پرتاب کا حال۔ اِدھر مولوی صاحب کا گھوڑا ہے تو ادھر پنڈت جی کی بھلی قیص ہند میں جہاں **محمود غزنوی** اور **بابر** کے حالات دیئے گئے وہاں **مہابھارت** اور رامائن کی کہانیاں بھی پوری تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہیں کہ نہ اسلامی باتیں ہندوؤں کو ناگوار گذر سکتی ہیں اور نہ ہندوؤں کی چیزیں مسلمانوں کو بری معلوم ہوتی ہیں۔ مسلمان انہیں پڑھکر مسلمان رہتا ہے اور ہندو، ہندو۔ اس کا سبب کیا ہے فقط یہی کہ وہاں یہ سب چیزیں رواداری انہ خلوص کے ساتھ محض علمی حیثیت سے پیش کی گئی ہیں نہ کہ متحدہ قومیت اور وطن پرستی جیسے سیاسی مقاصد کو مدنظر رکھ کر۔

ماحصل کلام

اختصار کی کوشش کے باوجود یہ تبصرہ بہت طویل ہوگیا۔ اور پھر بھی صرف اہم پہلوؤں پر بحث ہوسکی ہے۔ اگرچہ ابھی بہت سی باتیں تفصیل طلب ہیں۔ لیکن امید ہے کہ اتنی تشریح اس سلسلۂ کتب کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ جن اصحاب کو علمی اعتبار سے مزید تحقیق کرنا ہو وہ بذاتِ خود ان کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ انہیں یقیناً بہت کچھ دلچسپ مسالہ مل جائیگا۔ بہرکیف اس مضمون سے کم از کم ذیل کے نتائج بہ آسانی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) اس سلسلہ کتب میں مذہب کے متعلق بچوں کے ذہن میں وہ تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی رُو سے اسلام میں کوئی امتیازی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ کو بھی نہایت عامیانہ انداز میں پیش کرکے آپ کی عظمت کو عام سطح پر لا یا گیا ہے

(۲) گاندھی جی کے اہنسا کے اصولوں کی مختلف طریقوں سے موثر انداز میں تبلیغ کی گئی ہو

(۳) عالمگیر اسلامی اخوت کو نظر انداز کرکے وطن پرستی کے جذبہ کو راسخ کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) اسلامی تہذیب و ثقافت کے مقابلے میں ہندوؤں کے تمدن اور معاشرت کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ قومیت میں ڈھلنے کی بنیاد رکھی گئی ہے ۔

(۵) زبان کے لحاظ سے یہ کتابیں نہ اُردو میں ہیں نہ ہندی میں ۔ عام بول چال کی اُردو یا ہندوستانی میں ہندی کے غیر مانوس لفظ ٹھونس کر اُسے بگاڑا گیا ہے اور ایک مصنوعی ہندوستانی زبان پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے جو پیش خیمہ ہے اس زبان کا جسے اُردو کو مٹا کر ہندو یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں ۔

(۶) تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ سلسلۂ کتب بہت ناقص ہے اس میں جن جدّتوں کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ان میں اصولی خامیاں ہیں ۔ ابتدائی سبقوں میں بچوں کی نفسیات کا ضروری حد تک خیال نہیں رکھا گیا ۔ اور بہ حیثیت مجموعی اس نصاب کا علمی اور تعلیمی معیار بہت پست ہے

حال ہی میں مختلف تنقیدوں کے جواب میں جامعہ ملیہ کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ :۔

"ہم ان کتابوں میں بہ اجازت ٹکسٹ بک کمیٹی بمبئی ترمیم کرنے کو تیار ہیں ۔ یعنی ہندی کے غیر مانوس الفاظ بدل دیئے جائیں گے ۔ غرضیکہ اگلا اڈیشن اس شکل میں پبلک کے ہاتھوں میں آئے گا کہ کوئی معقول اعتراض باقی نہ رہے گا ۔"

مانا کہ چند الفاظ بدل دیے جائیں گے اور بعض مضامین میں کچھ ترمیم کر دی جائیگی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس نصاب کی سرے سے بنیاد ہی غلط ہو اُس کی اصلاح اس قدر آسانی سے کیونکر کی جاسکتی ہے اس میں تو ایسی اساسی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جن سے اس کی ہیئت ہی بدل جائے اور یہ صورت ایک بالکل نئے نصاب تیار کرنے کی مترادف ہوگی ۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اربابِ جامعہ کو ان کتابوں کی تیاری کے وقت یہ قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ اسلامی نقطۂ خیال سے یہ کس درجہ قابل اعتراض ہیں ۔ اِس امر کا احساس انہیں صرف اسوقت ہوا ۔ جب مُلک میں اِن

کتابوں کے خلاف اعتراضات کا طوفان اُٹھا۔ یہ بھی درست سہی کہ لفظوں جملوں اور سبقوں پر الگ الگ اعتراضات کے جواب دینے کے لیے طرح طرح کی توجیہیں کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ان اعتراضات کی پیش بندی کرنے کے لیے پہلے بھی بہت کچھ گنجائشیں رکھ لی گئی ہیں۔ مثلاً جہاں "ہری بھجن گا" کا فقرہ لکھا گیا اُس سے پہلے "مولا کیا ذکر" کا جملہ ضرور دبا دیا گیا ہے۔ جہاں بکرم اور تلک جیسے نام استعمال کیے گئے وہاں ساتھ ہی نادر کا نام بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ لیکن بہر صورت مجموعی طور پر ان کتابوں کا جو اثر بچوں پر پڑ سکتا ہے وہ اس قدر نمایاں ہے کہ کسی قسم کا نفسیاتی فریب اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اگر مسلمان بچوں کی تعلیم کی ابتدا ان کتابوں سے کی گئی تو پھر ہندی مسلمانوں کی آئندہ نسل کا خدا ہی حافظ ہے۔

اس نصاب کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ کسی غیر مسلم ادارہ کی طرف سے نہیں بلکہ ایک ایسے ادارہ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جس کو ملت اسلامیہ کے ساتھ نسبت ہے۔ یہ حیثیت اسے مسلمانوں کے لیے اور بھی خطرناک بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اسکے سبب غیر مسلم حکومتوں کو اپنے مخصوص مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ایک معقول آڑ مل جاتی ہے۔ چنانچہ مفصلہ بالا تمام خامیوں کے باوجود اس نصاب کو مسلمانوں کے سر منڈھا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے رائج کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا جائیگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی غیرت دینی اپنے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں کی اس متحدہ کوشش کا عملی جواب کیا دیتی ہے مغربی تعلیم کے اثرات کا تجربہ اچھی طرح کیا جا چکا ہے اسکے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اب اسی قسم کے ایک اور تجربہ میں قوم کے بچوں کی اثر پذیر طبیعت کو پہلے سے بھی زیادہ غیر اسلامی سانچے میں ڈھالنے پر رضا مند ہو جانا یقیناً ملت کی ناقابل تلافی غلطی ہو گی اور ایک وقت ایسا آئیگا جب بصد پشیمانی اکبر مرحوم کا یہ شعر بار بار دُہرانا پڑے گا ؎

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے ۔۔۔ دل بدل جائینگے تعلیم بدل جانے سے

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے۔ گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے۔ قیمت ۴ر محصولڈاک ۱ر

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱ر

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کر دیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۱ر

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اُردو کو تباہ کر کے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

4240 بر

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام اُمتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا، قرآن کریم کے حقائق و علوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

جو لوگ !

مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دُنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین !

کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور و فکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ؎ ۵

نمونہ مفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجیے! (منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)

Printed at the Jayyed Press, Delhi. Published by Z. A. K. from Tuluelslam Office, Delhi.